مطالعہءادب

(حصہ اول)

اُردو نوٹس معہ سمسٹر نصاب ونمونہ پرچہ سوالات

برائے

بی اے، بی کام، بی ایس سی (سال اول- میقات اول)

نیا نصاب 2016-17

گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد

از: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اُردو گراج گورنمنٹ کالج نظام آباد

MUTALEA e ADAB

BA,B.COM.BSc I YEAR I SEM

URDU NOTES,SYLLABUS& MODEL QUESTION PAPER

NEW SYLLABUS

GIRRAJ GOVT COLLEGE(A) NIZAMABAD

BY: **DR MOHAMMED ASLAM FAROQUI**

HEAD DEPT OF URDU

SEM I PAPER I URDU SL LEVEL CORE

HOURS / WEEK 4 -CREDITS 03

GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

(AUTONOMOUS NAAC RE ACCREDITED WITH B)

REVISED SYLLABUS FOR URDU SECOND LANGUAGE

BA.B.Com& B.Sc FIRST YEAR 2016-17

SEMESTER- I MODULE I

(Prose and Poetry)

یونٹ1: غزلیں ولؔی اورنگ آبادی 1۔پی کے ہوتے نہ کرتو مہ کی ثنا 2۔سجن کے باج عالم میں دگر نیں

غزلیں سراؔج اورنگ آبادی 1۔مجکو یکدم قرار نیں ہرگز 2۔جو تیرے غم کی تمنا نہ کیا

یونٹ2: غزلیں میر تقی میؔر 1۔کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں 2۔ہم سے ٹک آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ

غزلیں خواجہ حیدر علی آتؔش 1۔سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا 2۔خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری

یونٹ3: نظم:1) توحید:نظیر اکبر آبادی 2) مستقبل:اکؔبر الہ آبادی

نثر۔مظہر علی خاں ولا (حکایات) چند منتخب حکایات

یونٹ4: نظم:1) فنون لطیفہ:اقبال 2) پریت کا گیت: حفیظ جالندھری

نثر۔امتیاز علی تاج و بیگم قدسیہ زیدی (ڈراما) تلاش

یونٹ5: غزلیں جمیل نظام آبادی نثر۔مضمون۔ضلع نظام آباد کے تاریخی مقامات۔از۔نثر ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر

خارج کردہ نصاب :غزلیں۔محمد قلی قطب شاہ۔نثر مضمون۔سفر نامہ از صالحہ عابد حسین

شامل کردہ نصاب۔ نثر۔مضمون۔ضلع نظام آباد کے تاریخی مقامات۔از۔نثر ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

(AUTONOMOUS NAAC RE ACCREDITED WITH B)

MODEL PAPER FOR URDU SECOND LANGUAGE

BA.B.Com& B.Sc FIRST YEAR 2016-17

SEMESTER- I MODULE I

(Prose and Poetry)

Time: 2-1/2 hrs Max Marks : 70

PART A----(حصہ الف)----

ذیل میں سے تمام سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ ہر سوال کے دو نشان مقرر ہیں۔ 5x2=10

1۔ غزل کے پہلے شعر کو کیا کہتے ہیں۔ مثال کے ساتھ لکھئے۔
2۔ اقبال کے شعری مجموعوں کے نام لکھو۔
3۔ حکایت کسے کہتے ہیں۔
4۔ مضمون کی تعریف بیان کیجئے۔
5۔ ڈرامہ تلاش کے کرداروں کا تعارف بیان کیجئے۔

PART B----(حصہ۔ب۔)----

ذیل میں سے کوئی پانچ سوالات کے جوابات ایک پیراگراف میں لکھیں۔ ہر سوال کے 4 نشانات مقرر ہیں۔ 5x4=20

1۔ قافیہ اور ردیف کی تعریف کیجئے اور مثال دیجئے۔ ۔ولی کے شمالی ہند سفر سے اردو شاعری پر کیا اثرات پڑے۔
3۔ سراج اورنگ آبادی کے بارے میں لکھو۔ 4۔ میر کو کیوں مصور غم کہا جاتا ہے۔
5۔ نظم ''مستقبل'' کا مرکزی خیال بیان کیجئے۔ 6۔ آتش کا تعارف بیان کیجئے۔
7۔ نظم ''پریت کا گیت'' میں کس بات کو اجاگر کیا گیا۔ 8۔ ضلع نظام آباد کے اہم تاریخی مقامات کیا ہیں۔

PART C----(حصہ۔ج۔)----

ذیل میں سے تمام سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ ہر سوال کے 8 نشانات مقرر ہیں۔ 5x8=40

1 ۔ غزل کی تعریف کیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔ (یا) نظم ''توحید'' کا خلاصہ لکھئے
2 ۔ نظم ''فنون لطیفہ'' کا خلاصہ لکھئے۔ (یا) ڈرامے کی تعریف کیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔

3۔ حکایت کی تعریف کیجئے اور دو حکایتوں کا خلاصہ لکھئے۔ (یا) نظم ''مستقبل'' کا خلاصہ لکھو۔

4۔ ڈرامہ ''تلاش'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔ (یا) ضلع نظام آباد کے چند تاریخی مقامات کا ذکر کیجئے۔

5۔ مندرجہ ذیل اشعار میں سے کسی دو کی تشریح متن کے حوالے سے کیجئے۔

۱ پی کے ہوتے نہ کرتو مہہ کی ثنا معتبر نیں ہے حسن دور نما

۲ مجکوں یکدم قرار نیں ہر گز تجھ بغیر اختیار نیں ہر گز

۳ گھر گھر ہے ملک میں عشق میں دوزخ کی تاب تب بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش وہیں نہیں

۴ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالعہ ادب (حصہ اول)

بی اے، کام، بی ایس سی سالِ اوّل زبانِ دوم اردو نوٹس معہ ماڈل پیپر نیا نصاب

1st Year Second Language Urdu Notes & Model Paper

For BA' B.Com & B.Sc New Syllabus

سوال: غزل کی تعریف کیجئے اوراس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔

جواب: غزل کی تعریف: غزل اردو شاعری کی مقبول اور پسندیدہ صنف ہے۔ لغت میں غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں۔ لیکن شاعری کی اصطلاح میں غزل ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں جُدا جُدا اشعار میں زندگی کے مختلف موضوعات جیسے عشق، تصوف، غم، خوشی اورزندگی کے تمام مسائل بیان کئے جاتے ہیں۔ غزل کو کوزے میں سمندر بند کرنے کا فن کہتے ہیں۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہم ردیف ہوتے ہیں۔ غزل کے دیگر اشعار میں دوسرے مصرعے میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ہوتے ہے۔ غزل میں طاق اعداد میں 5 یا اس سے زیادہ اشعار ہوتے ہیں۔ غزل میں اگر دو اشعار میں ایک ہی خیال پیش کیا جائے تو اسے ''قطعہ'' کہتے ہیں۔ غزل کے اچھے شعر کو ''شاہ بیت'' یا حاصل غزل شعر کہتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر کو جس کے ذریعہ شاعر اپنی بات ختم کرتا ہے مقطع کہتے ہیں۔ عام طور پر شاعر غزل کے آخری شعر میں اپنا مختصر قلمی نام استعمال کرتا ہے۔ اسے تخلص کہتے ہیں۔ تخلص کے اوپر (ؔ) نشانی لگائی جاتی ہے۔ جیسے میرؔ، حالیؔ، غالبؔ وغیرہ۔

اردو میں فارسی کے اثر سے غزل کا آغاز ہوا۔ قلی قطب شاہ، ولیؔ، میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، ناسخؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، مومنؔ، حسرتؔ، دردؔ، فراقؔ، ناصرؔ کاظمی وغیرہ اردو کے مشہور غزل گو شاعر گذرے ہیں۔

مطلع: لفظِ مطلع طلوع سے بنا ہے۔ جس کے معنی ظاہر ہونا یا نکلنے کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں جس شعر سے غزل شروع ہوتی ہے یعنی غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعے، ہم قافیہ ہم ردیف ہوتے ہیں۔ غالبؔ کی غزل کا مطلع یوں ہے۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے ؎ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس مطلع میں ''زندگانی اور ٹھانی'' قافیے ہیں، جب کہ ردیف ''اور ہے'' ہے۔

قافیہ: غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے میں ردیف سے قبل استعمال ہونے والے ہم وزن لفظ یا الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ غزل میں قافیے کا استعمال تغزل اور لے پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ غزل چھوٹی ہو تو اس کے قافیے فطری لگتے ہیں۔ زیادہ اشعار کی غزل محض قافیہ پیائی ہوجاتی ہے۔ غالبؔ کی غزل کے قافیے اس طرح ہیں۔ زندگانی، ٹھانی، نہانی، سرگرانی، زبانی، آسمانی اور ناگہانی۔

ردیف: غزل کے اشعار میں مطلع کے دونوں مصرعوں اور باقی اشعار کے دوسرے قافیے کے بعد مسلسل استعمال ہونے والے لفظ یا الفاظ کو ردیف کہتے ہیں۔ نصابی کتاب میں شامل غالبؔ کی غزل کی ردیف ''اور ہے'' ہے۔ غزل میں ردیف ایک ہی ہوتی ہے لیکن قافیے بدلتے رہتے ہیں۔

مقطع: لفظ مقطع قطع سے بنا ہے۔ جس کے معنی چھوڑنا یا ترک کرنے کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں غزل کا آخری شعر جس کے ذریعہ شاعر اپنی بات ختم کرتا ہے۔ اسے مقطع کہتے ہیں۔ مقطع میں اکثر شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ غالبؔ کی غزل کا مقطع اس طرح ہے۔

ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام اک مرگِ ناگہانی اور

تخلص: وہ مختصر نام ہے جو شاعر اپنے کلام میں استعمال کرتا ہے اسے تخلص کہتے ہیں۔ بیشتر شعرا اپنے اصلی نام کے بجائے تخلص کی وجہ سے مشہور ہوتے ہیں۔ تخلص کے لئے شاعر کے نام ( ) نشانی لگائی جاتی ہے۔ چند شعرا کے نام اور تخلص اس طرح ہیں۔ ولی محمد ۔ولیؔ، مرزا اسد اللہ خان۔ غالبؔ، میر تقی۔ میرؔ، شیخ امام بخش ۔ ناسخؔ، خواجہ حیدر علی۔ آتشؔ، الطاف حسین ۔حالیؔ، میر ببر علی۔ انیسؔ، مرزا سلامت علی۔ دبیرؔ، شبیر حسن خان۔ جوشؔ، رگھوپتی سہائے ۔فراقؔ، نواب مرزا خان۔ داغؔ۔

سوال: اردو میں غزل گوئی کی روایت پر نوٹ لکھو؟

جواب: غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے اور ہندوستان کی گنگا جمنا تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے خط و خال میں زمانہ کے اتار چڑھاؤ کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو شاعری میں جو مقبولیت غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف سخن کو حاصل نہ ہوسکی۔ یوں تو غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہے لیکن اس صنف میں عشق تصوف' فلسفہ' دنیا کی بے ثباتی' شراب' بہار غرض کہ ہر مضمون کی گنجائش ہے۔ غزل کا فن نہایت ہی لطیف اور نازک ہے۔ اسلئے اس میں جذبہ اور خیال کی مکمل ہم آہنگی ضروری ہے۔ غزل کا فن اشارے کنائے کا فن ہے بے حجابی غزل کے مزاج کے خلاف ہے۔

اردو شاعری میں غزل کی روایت زمانہ قدیم سے رہی ہے۔ چنانچہ قدیم اردو یا دکنی شاعری میں بھی غزل کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ ولیؔ اورنگ آبادی نے غزل کے فن کو باقاعدگی بخشی اور اسکو دکن سے شمال میں متعارف کروایا۔ اسکے بعد شمالی ہند کے شعراء نے اسکے ارتقاء میں نمایاں رول انجام دیا۔ دبستان لکھنو کی روایات نے اس کے فن کو ٹھیس پہنچائی۔ جسکی وجہ سے غزل میں معاملہ بندی و خارج عناصر در آئے۔ اور غزل میں چٹخارے کا عنصر پیدا ہوگیا۔

1857ء کے انقلاب کی وجہ سے ہندوستان کی سماجی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس انقلاب نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ ہندوستانی عوام کو نئے حالات اور نئے تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ اس کا اثر ادب پر بھی ہونا ضروری تھا۔ اس انقلاب کی وجہ سے عام ہندوستانی عوام میں بیداری کا شعور پیدا ہوا۔ غالبؔ اور انکے شاگرد مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اس دردناک مناظر کو بچشم خود دیکھا۔ اور محسوس کیا تھا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

مولانا حالیؔ نے اردو غزل کی اصلاح کیلئے نمایاں خدمات انجام دیں۔ حالیؔ کی ذہنی نشوونما میں غالبؔ' محمد حسین آزاد اور سرسید نے بھی انہیں اسکی ترغیب دلائی۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے بعد حالیؔ کو ایک نئی راہ ملی۔ چنانچہ انہوں نے شعوری طور پر مغربی ادب کو اردو سے روشناس کروانے کی سب سے پہلے کوشش کی اور انکی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ چنانچہ اردو میں جدید غزل کا آغاز حالیؔ سے شروع ہوتا ہے۔ یوں تو غزل میں سماجی اور سیاسی مسائل میرؔ سے ملنا شروع ہوجاتے ہیں۔ لیکن حالیؔ نے غزل کی روایت میں زندگی کے مسائل کو شامل کرکے اسکو ایک نیا مزاج عطا کرنے کی شعوری کوشش کی۔ ان کے بعد ہی جدید اردو غزل کا ارتقاء ہوتا ہے۔

غزل 1 از: ولؔی دکنی

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1) شعر پی کے ہوتے نہ کرتوں مہ کی ثنا معتبر نئیں ہے حسن دور نما

حوالہ: یہ شعر ولؔی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے

تشریح: غزل کے مطلع میں شاعر ولؔی دکنی کہتے ہیں کہ محبوب کے ہوتے ہوئے کسی کو چاند کی تعریف نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ جو حسن سامنے ہے اس کے مقابلے میں دور رہنے والے چاند کی تعریف کرنا مناسب نہیں ہے۔ دور کے حسن کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ اپنا محبوب تو مجسم سامنے موجود ہے۔ اس طرح خواب وخیال کی جنت بسانے کے بجائے حقیقت کی زندگی گذارنے کی تلقین کرر ہا ہے۔ انساں خواب میں بہت کچھ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے روبرو حقیقت ہے وہی اصل ہے۔

مرکزی خیال: شاعر دور سے حسین دکھائی دینے والے چاند کے بجائے سامنے موجود اپنے محبوب کی تعریف کی تلقین کرر ہا ہے۔ کیونکہ شاعر کا محبوب جیسا بھی ہے اس کا اپنا ہے جب کہ چاند پر اس کا اختیار نہیں۔

2) شعر باعث نشہ دو بالا ہے حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

حوالہ: یہ شعر ولؔی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر ولؔی غزل کے اس شعر میں کہتے ہیں کہ یہ اچھی بات ہے کہ انسان کے پاس اچھی صورت کے ساتھ اچھے اخلاق بھی ہوں۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ ایک انسان میں یہ دونوں صفات ایک ساتھ جمع ہوں، اگر انسان میں یہ دونوں صفات جمع ہو جائیں تو وہ خوش قسمت انسان ہے۔ ایسے انسانوں کو دنیا والے بھی پسند کرتے ہیں۔

مرکزی خیال: اچھی صورت اور اچھی سیرت کا ایک انسان میں یکجا ہو جانا سب کے لئے مسرت کی بات ہے۔ اس لئے اچھی صورت رکھنے والوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر اچھی صفات بھی پیدا کریں۔ تب وہ سب کے لئے پسندیدہ ہونگے۔

3) شعر نئیں ہے گل پی کے مکھ سا عالم میں قائل اس بات کی ہے بادِ صبا

حوالہ: یہ شعر ولؔی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر ولؔی اپنے محبوب کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے محبوب جیسا کوئی بھی پھول نہیں ہے۔ عام طور سے پھول کو خوبصورت کہا جاتا ہے۔ لیکن شاعر اپنے محبوب کو پھول سے بھی خوبصورت کہتے ہوئے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ کوئی پھول بھی اس کے محبوب جیسا حسین وجمیل اور نازک نہیں ہے۔ اس بات کو میں ہی نہیں بادِ صبا بھی تسلیم کرتی ہے۔ میں اپنے محبوب کے حسن کے بیان میں کچھ زیادہ ہی کہہ دوں لیکن صبح کی ہوا جو چمن چمن پھرتی ہے وہ بھی اس بات کی قائل ہے اور گواہی دے رہی ہے کہ شاعر کا محبوب پھول جیسا خوبصورت ہے۔ اور دنیا میں کوئی بھی پھول اس جیسا نہیں ہے۔

مرکزی خیال: شاعر اپنے محبوب کے حسن کا دیوانہ ہے وہ اس پر فریفتہ ہے اس لئے وہ اس کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے اسے پھول سے بھی خوبصورت قرار دے رہا ہے۔

4)شعر اے ولی سخن کوں ووبوجھے جس کوں حق نے دیا ہے فکر رسا

حوالہ: یہ شعر ولی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح: شاعر ولی غزل کے مقطع میں اپنی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے کلام کو وہ ہی سمجھ سکتے ہیں جنہیں خدا نے بہت علم دیا ہے اور صحیح فکر اور سوچ دی ہے۔ کیونکہ میرے کلام میں معنی و مفہوم کے سمندر پوشیدہ ہیں۔ میرے کلام کے گہرے معنی وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جنہیں علم کے ساتھ اعلیٰ فکر بھی حاصل ہے۔ اس طرح شاعر ایک طرف تو اپنی شاعری کی گہرائی کا ذکر کر رہا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو بھی اس بات کی ترغیب دلا رہا ہے کہ وہ اس کلام کے معنی سمجھنے کی اپنے اندر فکر پیدا کریں۔

مرکزی خیال: شاعر کو اپنے کلام کی گہرائی اور معنویت کا اعتراف ہے۔ اس لئے وہ لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ میرا کلام گہرے معنی لئے ہوئے ہے۔ اس لئے میرے کلام کو سمجھنے کے لئے علم اور خدا کی توفیق کی ضرورت ہے۔

غزل 2 از ولی دکنی

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1)شعر سجن کے باج عالم میں دگرنیں ہمن میں ہے ولے ہم کو خبرنیں

حوالہ: یہ شعر ولی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: شاعر ولی اپنی غزل کے مطلع میں کہتے ہیں کہ میرے محبوب جیسا خوبصورت اور با اخلاق اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اتنی اعلیٰ صفات والا میرا محبوب ہمارے درمیان موجود ہے لیکن ہمیں اس کی خبر نہیں ہے۔ یہ انسانی صفت ہوتی ہے کہ ان کے درمیان کوئی اعلیٰ صفات والا انسان موجود رہتا ہے لیکن زندگی میں اس کی قدر نہیں کی جاتی۔ جب وہ اس دنیا سے گذر جاتا ہے تو لوگ اسے یاد کرتے ہیں اور اس کے چلے جانے پر افسوس کرتے ہیں۔

مرکزی خیال: انسان کی زندگی میں قدر نہیں ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد اسے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن شاعر اپنے محبوب کو نہ صرف یاد کرتا ہے بلکہ اسے دنیا کا سب سے خوبصرت انسان قرار دیتے ہوئے اس کی قدر دانی پر زور دیتا ہے۔

2)شعر عجب ہمت ہے اس کی جس کوں جگ میں بغیر از یار دوجے پر نظرنیں

حوالہ: یہ شعر ولی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر ولی غزل کے اس شعر میں کہتے ہیں کہ میرا محبوب اس دنیا میں اپنے یار کے علاوہ کسی اور پر نظر نہیں رکھتا۔ وہ اپنی امداد کے لئے کسی اور کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ بلکہ اپنے عاشق پر اسے اطمینان ہے۔ انسان کو دنیا میں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے صرف خدا سے مدد مانگنا چاہئے۔ اور کسی اور کی طرف امید سے نظر نہیں ڈالنا چاہئے۔

مرکزی خیال: انسان کوصرف اللہ سے محبت رکھنی چاہیئے۔اوراپنی تمام ضروریات اسی سے طلب کرنی چاہیئے۔

3)شعر نہ پوچھو درد کی بے دردسوں بات کہے کیا بے حبر جس کوں خبر نیں

حوالہ: یہ شعر وؔلی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شاعر وؔلی غزل کے اس شعر میں عشق کے درد کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق کے درد کی کیفیت وہ ہی جانتا ہے جو عشق میں مبتلا ہے۔جولوگ غمِ عشق میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔انہیں کچھ خبر ہی نہیں کہ عشق کیا ہے اس کا درد کیا ہے۔انسان کو جب کسی کام کی دھن سوار ہوجاتی ہے تو وہ اس کو انجام دینے کے پیچھے لگ جاتا ہے۔اوراس کام کی راہ میں جو کچھ رکاوٹیں،تکالیف اور پریشانیاں آئیں انہیں خوشی سے برداشت کرتا ہے۔اس انسان کو معلوا م رہتا ہے کہ کوئی کام کرنے کے دوران کیا کیا تکالیف پیش آتی ہیں۔اگر وہ اپنی تکالیف کا دوسروں سے ذکر بھی کرے تو انہیں اس کا احساس نہیں رہتا۔

مرکزی خیال: درد کی بات کو بے دردی سے نہیں پوچھنا چاہیئے۔درد کا مزہ وہی لوگ جانتے ہیں جو درد میں ڈوبتے ہیں۔

4)شعر وؔلی اس کی حقیقت کیونکہ پوچھوں کہ جس کا بوجھنا حد بشر نیں

حوالہ: یہ شعر وؔلی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: شاعر وؔلی غزل کے مقطعے میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدااوراس کی عالی شان قدرت کے جر راز ہیں وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔یہ انسانی عقل اوراس کی حد کے آگے کی بات ہے کہ انسان خدا کی ذات اوراس کی قدرت کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔انسان کوصرف اتنا جان لینا چاہیئے کہ اس کائنات اورانسان کو بڑی قدرت والے ایک خدا نے پیدا کیا ہے۔انسان کو اسی کی عبادت کرنی ہے اورموت کے بعد اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

سوال:وؔلی اورنگ آبادی کی شاعری پرنوٹ لکھو؟

جواب: وؔلی محمد نام اور وؔلی تخلص تھا۔ابتدائی حالات زندگی کسی حدتک پردہ خفا میں ہیں۔اتنا پتہ چلتا ہیکہ 1649ء سے قبل اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اوروہیں ان کی پرورش وتربیت ہوئی۔ان کے کلام سے پتہ چلتا ہیکہ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے اورعلم کے شوق میں انہوں نے دوردراز کے سفر اختیار کیئے۔چنانچہ پتہ چلتا ہیکہ بیس سال کی عمر میں تکمیل علم کیلئے گجرات گئے اورعرصہ درازتک وہاں قیام کیا۔وہاں نہ صرف علوم ظاہری کا اکتساب کیا بلکہ حضرت شاہ وجیہہ الدین گجراتی سے فیض باطنی بھی پایا۔قرآن حدیث اورفقہ کے علاوہ علم عروض پر کافی دسترس حاصل تھی۔ 1700ء کے لگ بھگ انہوں نے دلّی کا سفر کیا اوردلّی کے مشاعروں میں کلام سنا کرنئی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ان کے اشعار دیکھتے ہی دیکھتے دلّی کے عوام میں مقبول ہوگئے۔دلّی کے شعراءان کی پیروی میں فارسی کو خیر باد کہہ کراُردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

دلّی میں وؔلی کی ملاقات سید سعداللہ گلشؔن سے ہوئی جوایک صوفی اورمعروف شاعر تھے۔چونکہ وؔلی خود بھی ایک صوفی منش آدمی تھے۔اس لئے وہ شاہ گلشؔن سے جلد ہی مانوس ہوگئے۔کہا جاتا ہیکہ شاہ گلشؔن نے انہیں فارسی کے غیر مستعملہ مضامین کواُردو میں سمونے کا مشورہ دیا۔چنانچہ وؔلی نے اس پرعمل کیا۔اوراُردو شاعری کو نئے مضامین اور نئے خیالات سے روشناس کیا۔دوسری طرف دلّی کے وہ شعراء جواب تک فارسی ہی میں شعر کہنے کو باعثِ افتخار سمجھتے اوراس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ تقریباً چارسوسال سے دکن میں اُردو

نظم ونثر لکھی جارہی ہے۔جبکہ دلّی میں اس کو ریختہ یا گری پڑی زبان سمجھا جاتا تھا۔لیکن جب دلّی کے عام شعراء نے ولؔی کو اس زبان میں روانی کے ساتھ شعر کہتے سنا تو پہلے متعجب ہوئے اور پھر اسی طرز میں شعر کہنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے دلّی کے گلی کوچوں میں اُردو شاعری کی دھوم مچ گئی۔

ولؔی کو اُردو شاعری کا ''باوا آدم'' بھی کہا جاتا ہے۔انہوں نے اُردو شاعری میں عموماً اور اُردو غزل میں خصوصاً اپنی فن کاری کا کامیاب مظاہرہ کیا۔ولؔی کی شاعری میں فطری پن اور بے ساختگی نمایاں طور پر محسوس بے ساختگی کے ساتھ ملتی ہیں۔ان کی شاعری میں تکلف یا بناوٹ نہیں اور نہ ہی وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ولؔی کو اُردو شاعری میں اس لئے فوقیت حاصل ہیکہ انہوں نے سب سے پہلے اُردو شاعری میں حسن وعشق کے بیان میں صداقت اور حقیقت سے کام لیا۔ولؔی کی اُردو غزل سے متاثر ہوکر شمالی ہند کے فارسی گو شعراء اُردو شعر گوئی کہنے کے طرف مائل ہوئے۔اس لئے انہیں اُردو غزل کا نقاش اور امام تسلیم کیا گیا۔

ولؔی کی اہمیت اُردو شاعری میں سب سے زیادہ اس لئے ہیکہ انہوں نے قدیم اُردو کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر کے سارے ہندوستان میں ادبی ابلاغ وترسیل کا ذریعہ بنایا۔ولؔی کا انتقال 1741ء میں ہوا۔

ولؔی کی غزل گوئی کی خصوصیات: ولؔی کو سب سے پہلے اس لئے اولیت حاصل ہیکہ انہوں نے اُردو شاعری کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر کے اس کو سارے ہندوستان میں ترسیل خیالات کا ذریعہ بنایا اور اپنے دور کے تمام ادبی وفکری معیارات اور روایات کو اپنی شاعری میں سمو کر بیان کی لذت اور زبان کی تعمیر کا معجزہ دکھایا۔ ولؔی اورنگ آبادی نے اُردو شاعری اور خاص کر اُردو غزل میں اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ کیا ہے۔ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت فطری انداز اور بے ساختگی ہے۔ولؔی نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کی واردات اور کیفیات کو بڑی بے ساختگی اور روانی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کی غزلیات میں تکلف یا بناوٹ کا کہیں بھی نشان نہیں۔وہ حسن وعشق کے معاملات میں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیتے۔ولؔی کو اُردو غزل میں اس لئے امتیاز حاصل ہیکہ انہوں نے حسن و عشق کے جذبات کی عکاسی میں صداقت اور حقیقت سے کام لیا اور غزل کے فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں رول انجام دیا۔

ولؔی اورنگ آبادی نے اُردو غزل گوئی میں ایسا رنگ وآہنگ اور ایسی فطری دلکشی پیدا کی کہ ان کے اکثر ہم عصر شعراء نے ان کی تقلید کی۔ولؔی کی غزلوں میں بڑی نرم و نازک اور حسین تشبیہات اور استعارے ملتے ہیں۔ان کے پاس بعض تشبیہات اور استعارے بالکل اچھوتے اور نادر قسم کے ہیں۔وہ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ کو اپنی شاعری میں سمو کر ایک نیا انداز پیدا کرتے ہیں۔ولؔی نے اپنے عہد کے الفاظ اور تراکیب کو بڑی کثرت سے اپنی شاعری میں استعمال کیا جو آج کل متروک ہو چکے ہیں۔ ولؔی کو حسن وعشق کی ترجمانی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ان کی غزل کا محبوب ایک ہندوستانی عورت ہے جو ہندوستانی آداب ولحاظ سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ولؔی کے آخری دور کی شاعری میں فارسی الفاظ اور فارسی اسالیب کا بڑا خوشگوار اضافہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ولؔی کی شاعری کے مطالعہ سے ان کے عہد کی تہذیب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ولؔی اپنے دور کے معیارات اور رجحانات سے بہ خوبی واقف تھے۔اس لئے انہوں نے اپنے دور کے ادبی معیارات وافکار کو سمو کر یادگار بنادیا ہے اور اپنے بعد آنے والے شعراء کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔

غزل 1 از: سراؔج اورنگ آبادی

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1) شعر مجھکو یکدم قرار نہیں ہرگز — تجھ بغیر اختیار نہیں ہرگز

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: غزل کے مطلع میں سراؔج اپنے عشق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کے بغیر مجھے ایک لمحہ بھی چین وسکون حاصل نہیں ہے اور میں محبوب کے بغیر ہوش وحواس میں نہیں رہتا یہ شعر عشق حقیقی میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق حقیقی میں بندہ اپنے محبوب خدا سے دور رہتا ہے وہ اس دنیا میں قیدی کی طرح زندگی گذارتا ہے اور ہر لمحہ اپنے محبوب کے دیدار اور اس کی ملاقات کیلئے بے چین رہتا ہے اس کی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے بندہ اپنے خدا سے محبت اور تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ عشق کے سبب دنیا کے کام بھی ہوتے ہیں انسان کو دنیا کے کاموں میں کسی چیز کو حاصل کرنے کی حواہش نہ ہو تو وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اور کسی کام کا نہیں رہتا اس لئے ہر انسان کو خدا سے عشق رکھنا چاہئے اور دنیا کے کاموں کو کرنے کی جستجو کرنا چاہئے۔

مرکزی خیال: شاعر خدا کے عشق میں ڈوبا ہوا ہے اور محبوب کے بغیر اسے چین نہیں آتا اور نہ ہی اس کے ہوش وحواس قائم ہیں اپنے مقصد کے حصول کیلئے شدت جذبات کا اظہار کیا یا ہے۔

2) شعر بزم عشاق میں ارے زاہد — عقل کوں اعتبار نہیں گز

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں سراؔج نے عقل کے مقابلے میں عشق کی برتری ظاہر کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ عاشقوں کی محفل ہے۔ یہاں لوگ اپنے مالک حقیقی خدا سے سچا عشق کرتے ہیں انہیں دنیا کی فکر نہیں ہوتی اور نہ وہ دنیا کے کاروبار کے بارے میں اپنی عقل سے سوچتے ہیں نہ ہی اسباب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ عقل سوچتی ہے کہ آگ میں جائیں گے تو آگ جلا دیگی' پانی انسان کو ڈوبا دیا گا لیکن خدا کے سچے عاشق بندے ابراہیم علیہ السلام بے خطر آگ میں کود پڑے تھے اور آگ نے ان کا کچھ نہ بگاڑا اور ان کیلئے سلامتی والی ہوگئی۔ موسیٰ علیہ السلام دریا میں کود پڑے تو پانی میں ان کیلئے راستہ بن گیا۔ اگر یہ لوگ اپنی عقل سے سوچتے تو آگے بڑھ کر کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے خدا کے معاملات میں انسان کو پرواہ کئے بغیر خدا کی منشاء کو پورا کرنے کیلئے آگے بڑھ جانا چاہئے تب ہی دنیا میں بڑے کارنامے انجام دیئے جاسکتے ہیں۔

مرکزی خیال: عشق کے معاملات میں عقل سے نہیں سونچا جاتا اور بے خطر آگے بڑھا جاتا ہے تب ہی منزل حاصل ہوتی ہے۔

3) شعر آشتابی کہ آج بے کل ہوں — طاقت انتظار نیں ہرگز

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر سراؔج اپنے محبوب سے مخاطب ہیں۔ اور اس سے جلدی آنے کیلئے کہہ رہے ہیں کہ میں تیرے لئے بے قرار ہوں اور میری یہ حالت ہوگئی اور اس سے ملاقات کیلئے اپنے شدید جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ عاشق میں اتنی سکت نہیں کہ وہ محبوب کو تلاش

کرے اور خود اس سے ملے اس لئے وہ خود خدا کو ملنے کیلئے کہہ رہا ہے انسان کو پتہ ہے کہ وہ کمزور ہے زندگی اس کی راہ میں حائل ہے اور موت کے بعد ہی اپنے مالک کا دیدار کرسکتا ہے۔اس لئے وہ بالواسطہ طور پر خدا سے ملاقات کی اپنی چاہت اور بے چینی کا تذکرہ کرتا ہے۔

مرکزی خیال: محبوب سے دوری کے جذبات شدید ہو گئے ہیں اب مزید انتظار کی قوت نہیں اس لئے اے محبوب تو جلد مجھ سے مل جا۔

4) شعر **سیر کر گلشن محبت کا** **گل جنت کوں خار نیں ہرگز**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر سراؔج نے محبت کے جذبہ کی اہمیت، پاکی وعظمت بیان کی ہے اور کہا کہ محبت کا جذبہ اعلیٰ وارفع ہوتا ہے۔اس میں کوئی خرابی نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی طرح کا غم اور پریشانی ہوتی ہے۔محبت کو پھولوں کے ایک باغ سے تشبیہ دیتے ہوئے سراؔج کہتے ہیں کہ جس طرح جنت کے پھولوں کو کانٹے نہیں ہوتے اسی طرح محبت کے جذبہ میں نفرت نہیں ہوتی۔اس لئے شاعر لوگوں کو محبت کے جذبہ سے سرشار ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔شاعر خود ساختہ عشق ومحبت میں ڈوبا ہوا ہے اور اس نے محبت کا مزہ چکھا ہے اور وہ اپنے تجربہ سے دوسروں کو بھی واقف کرا رہا ہے۔

مرکزی خیال: محبت کے جذبہ میں نفرت نہیں ہوتی اس لئے سب کو محبت کے جذبہ سے سرشار ہونا چاہئے۔

5) شعر: **میکشان شراب وحدت کوں** **روز محشر خمار نیں ہرگز**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں سراؔج کہتے ہیں کہ جو لوگ خدائے وحدہ لاشریک کی محبت میں ڈوبے رہتے ہیں انہیں حشر کے میدان میں اور آخرت میں کسی قسم کی دشواری اور رسوائی نہیں ہوتی۔اور وہ خوشی خوشی جنت میں داخل کردیئے جاتے ہیں اور دیدار الہٰی کی نعمت سے سرفراز کئے جاتے یں۔شاعر کو یقین ہے کہ جو خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا جس کا ہو جاتا ہے اسے دنیا کے سبھی غم ہلکے دکھائی دیتے ہیں اور آخرت میں حشر کے میدان میں جبکہ لوگ نفسا نفسی کے عالم میں رہتے ہیں صرف ایک خدا کو ماننے والے سکون میں رہتے ہیں۔

مرکزی خیال:۔ایک خدا سے محبت کرنے والوں کو دنیا کا کوئی غم نہیں رہتا اور وہ آخرت میں حشر کے میدان میں بھی پرسکون و مطمئن رہتے ہیں۔

6) شعر: **کوچہ بے خود میں مجنوں کوں** **سگ لیلی سیں عار نیں ہرگز**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں محبوب کی اداؤں کو پسند کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ شاعر کو اپنے محبوب کی ہر چیز بھلی لگتی ہے۔جس طرح مجنوں کو لیلی کا کتا بھی اچھا لگتا تھا اسی طرح خدا سے محبت کرنے والا سچا عاشق بندہ اس کائنات کی ہر شئے میں اپنے محبوب خدا کی جھلک دیکھتا ہے۔اسے خدا کا ہر حکم اچھا لگتا ہے۔اور اس پر عمل کرنے میں وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔

مرکزی خیال: اپنے محبوب خدا کی ہر ادا کو پسند کرنا اور خدا کے احکامات پر عمل کرنا اور نافرمانی سے بچنا سچے عاشق بندے کی شان ہے۔

7) شعر:۔ **ہجر کی رات میں مثال سراؔج** **اشک غم کا شمار نیں ہرگز**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں شاعر اپنے محبوب سے دوری کے سبب رات میں بہائے گئے آنسوؤں کا تذکرہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہجر کی راتوں

میں میں نے بے حساب آنسو بہائے ہیں۔اپنے آنسوؤں کو بے حساب قرار دیتے ہوئے شاعر اپنی تڑپ اور محبت کی شدت کا اظہار کرتا ہے اور خدا سے سچی محبت کرنے والے عاشقوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ بھی خدا کی یاد میں روئیں اور اس کی یاد سے غافل نہ رہیں۔یہی وجہ ہے کہ سچے مومن بندے رات کے وقت جبکہ ساری دنیا نیند کے مزے لیتی رہتی ہے اپنے بستروں سے اٹھتے ہیں اور اندھیرے میں خدا کی یاد کرتے ہوئے چپکے چپکے آنسو بہاتے رہتے ہیں خدا کو ایسے ہی راتوں میں رونے والے بندے پسند ہیں۔

مرکزی خیال: خدا سے دور سچے عاشق بندے رات میں اٹھ کر خدا کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں یہ آنسو دنیا کے کسی بھی بڑے خزانے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

غزل2 از: سراؔج اورنگ آبادی

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1)**شعر:۔ جو تیرے غم کی تمنا نہ کیا ابدی عشق کا سودا نہ کیا**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: غزل کے مطلع میں سراؔج کہتے ہیں کہ جس انسان میں اپنے خدا کی یاد نہ ہو اور جو خدا کی یاد میں نہ تڑپے وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔خدا کے سچے عاشقوں کو اپنے مالک خدا سے اُس کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ہونی چاہئے۔ انسان کی یہ تمنا ہونی چاہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یاد میں تڑپے ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے یہ راستہ دین اسلام کا ہے۔ جو اس غم میں ڈوب کر زندگی گذارے گا اس کی دنیا بھی کامیاب ہوگی اور آخرت میں بھی وہ سرخرو ہوگا۔

مرکزی خیال: خدا اور اس کے رسول ﷺ کی محبت تمام انسانوں کی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔

2)**شعر اپنی آنکھوں سے جو پنہاں نہ ہوا اس سیس کچھ عمر میں پیدا نہ ہوا**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں سراؔج انسان سے کہتے ہیں کہ اگر وہ اپنے وجود کو نہ مٹائے تو کچھ بن نہیں سکتا اور اپنے وجود کو مٹا کر دنیا میں کچھ نام نہ کمایا تو اس نے اپنی عمر یوں ہی گذار دی۔مشاہدہ ہے کہ بے جان بیج جب تک زمین کے اوپر رہے اس میں سے پودا نہیں پیدا ہوتا۔اگر اس بیج کو زمین کے اندر ڈالا جائے اور اسے پانی دیا جائے تو بے جان بیج میں سے جاندار پودا نکل آتا ہے۔اُسی طرح انسان بے کار پڑا رہے تو زندگی میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔اگر کسی انسان کو دنیا کے مسائل کا حل نکالنا ہوگا تو اسے اپنی جان اور مال اور وقت کو کسی مقصد کے پیچھے لگانا ہوگا تب ہی انسان کچھ کامیابی حاصل کرسکتا ہے اور اپنی دنیا اور آخرت بنا سکتا ہے بے کار انسان کی زنگی بھی بے کاری میں گذر جاتی ہے۔

مرکزی خیال: زندگی میں کوئی مقصد حاصل کرنے کیلئے اپنی جان، مال اور وقت کو لگانا پڑتا ہے بے کاری سے زندگی برباد ہوتی ہے۔

3)**شعر:۔ حیف ہے اس کی تماشہ بینی چشم باطن کوں جو کوئی وا نہ کیا**

حوالہ: یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: اس شعر میں سراجؔ ان لوگوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں جو دنیا میں آئے دن پیش آنے والے واقعات اور حادثات سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ اس کائنات میں مخلوقات کو دیکھتے ہوئے ان کے اور خود انسان کے خالق خدا کو نہیں پہچانتے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ کائنات کی مخلوقات' سورج' چاند' ستارے' زمین' آسمان کو دیکھ کر خالق خدا کی عظیم قدرت کو پہچانے۔ اسی طرح دنیا میں ہونے والے واقعات کو بغور دیکھیں کہ بارش بادلوں سے نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ زمین سے غلہ نہیں اُگتا بلکہ اللہ کی مرضی سے زمین غلہ اُگاتی ہے۔ ڈاکٹر یا دوا میں شفا نہیں بلکہ اللہ کی مرضی سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح کی نظر پیدا کرنے والے ہی خدا کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا کی معرفت حاصل کرنے کیلئے انسان کو خدا کی یاد میں زندگی گذارنا چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ہر حال میں خدا کے حکم کو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر پورا کرے۔

مرکزی خیال: کائنات میں غور و فکر کرنا چاہئے اور روزمرہ حادثات پر اسباب کو نہیں بلکہ مسبب الاسباب خدا کی مرضی کو پہچاننا چاہئے اگر کوئی ایسی نظر پیدا نہ کر سکے تو اس کی زندگی پر افسوس ہے۔

4) شعر:۔ مدتوں لگ حرم و دیر پھرا میں تیرے واسطے کیا کیا نہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر سراجؔ اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں سراجؔ عابد بندے کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کے سچے عاشق اور عبادت گذار بندے خدا کو یاد کرتے ہوئے اس کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کیلئے سخت محنت کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے امتحانات سے گذرتے ہیں۔ اور پھر خدا سے ہمیشہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے خدا تو مجھ سے راضی ہو جا۔ میری بگڑی بنا دے اور مجھے دنیا و آخرت میں کامیاب بنا دے۔ اس شعر میں خدا کی یاد اور اُسے تلاش کرنے کی اسی انسانی کوشش کا ذکر کیا گیا ہے۔

مرکزی خیال:۔ انسان کو خدا کی یاد میں زندگی گذارنا چاہئے۔ وہ اس کی رضاء حاصل کرنے کیلئے مسلسل کوشش کرتے ہوئے دعاؤں کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

5) شعر:۔ میں کیا دل کو گل داغ سیں داغ یار نے عزم تماشہ نہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر سراجؔ اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے دل پر لگے غموں کے داغ کو باغ سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ محبوب کی دوری نے میرے دل پر غموں کے داغ لگائے ہیں وہ چونکہ میرے محبوب کے دیئے ہوئے ہیں اس لئے میں ان داغوں کو پھول سمجھ کر دل میں محفوظ کر لیتا ہوں اور اب یہ داغ ایک گلستان بن گئے ہیں۔ یہ چونکہ عشق کا معاملہ ہے اور عشق میں راز داری برتی جاتی ہے اور آپسی باتوں کو سرعام نہیں لایا جاتا اس لئے میں محبوب کی طرف سے ملے دل کے داغوں کو دوسروں کو دکھانا نہیں چاہتا۔ اس میں ہم دونوں کی رسوائی ہے۔ خدا کی یاد میں ڈوبے بندے زندگی میں آنے والے دکھ درد کو خدا کا امتحان سمجھ کر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ صبر سے کام لیتے ہیں اور دنیا والوں کے سامنے اپنی غربت لاچاری بھوک کے گلے شکوے نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ایسے ہی صابر بندوں سے خوش ہوتا ہے۔

مرکزی خیال: زندگی میں آنے والے دکھ درد پر صبر کرنا چاہئے اور پریشانیوں کو دیکھ کر خدا سے گلے شکوے نہیں کرنا چاہئے۔ صبر و شکر کے ساتھ زندگی گذارنی چاہئے۔

6)شعر:۔ باغ میں نرگس بیمار طرف گوشہ چشم سیں ایمانہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں سراؔج اورنگ آباد نے اپنے محبوب کی بے رخی کی طرف اشارہ کیا ہے۔اور کہا کہ میں عشق کا مارا بیمار ہوں اور میرے محبوب نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اس شعر میں نرگس اور چشم کے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کلام میں خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔نرگس اور چشم کو شاعری کی اصطلاح میں آنکھوں کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ لوگوں کے ہجوم میں میرے محبوب نے مجھے دیکھا بھی نہیں اور نہ ہی میری طرف نظر التفات کی۔محبوب کی اس بے وفائی اور بے رُخی سے مجھے تکلیف ہوئی۔

مرکزی خیال:۔ محبوب سے بے وفائی کی شکایت ہے۔شاعر نے اپنے عشق کے شدید جذبے کو محبوب کی شکایت سے ظاہر کیا ہے۔

7)شعر:۔ جل گیا شوق کے شعلوں میں سراؔج اپنی دانست میں بے جانہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر سراؔج اورنگ آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ غزل کا مقطعہ ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مقطع میں سراؔج کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب حقیقی خدا کی یاد کی آگ میں جل گیا۔یعنی میں نے اپنے آپ کو یادالہیٰ میں ڈبو دیا۔مجھے اس عمل پر اعتماد ہے۔اور امید ہے کہ خدا مجھ سے راضی ہوگا اور بہت جلد مجھے دیدار الہیٰ نصیب ہوگا۔ایک سچے عاشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ محبوب کی خاطر اپنے آپ کو مٹا دیتا ہے اور عشق کی دیوانگی پر مطمئن رہتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ یادالہیٰ اور اطاعت الہیٰ میں انسان کو مصروف رہنا چاہئے اور اپنی کوشش سے مطمئن رہنا چاہئے۔

سوال:۔ سراؔج اورنگ آبادی پر ایک نوٹ لکھئے؟ (یا) سراج کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کیجئے؟

جواب:۔ سراؔج اورنگ آبادی (1713-1764) اورنگ آباد دکن سے تعلق رکھنے والے اردو غزل کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے ان کا اصلی نام سراج الدین تھا۔والد کی صحبت میں رہتے ہوئے سراؔج کو بھی بچپن سے تصوف اور شاعری سے لگاؤ پیدا ہوگیا۔کم عمری میں شعر کہنے لگے۔اور ایک ضخیم کلیات تیار ہوگیا۔سراؔج نے اپنے مرشد شاہ عبدالرحمٰن کی ہدایت پر 1740 سے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ دکن کی شعری روایات کو آگے بڑھایا۔ولؔی کے بعد سراؔج دکن کے بڑے شاعر گذرے ہیں۔سراؔج نے غزلوں کے علاوہ مثنوی بھی لکھی۔ان کی مثنوی ''بوستان خیال'' کے نام سے مشہور ہے۔سراج کے کلام میں روانی پائی جاتی ہے۔ سراؔج نے غزل' قصیدہ' مثنوی' رباعی سبھی اصناف میں شاعری کی۔لیکن ان کی غزلیں اور مثنویاں ہی مشہور ہوئیں۔سراؔج کی غزل میں عشق مجازی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ان کا ایک شعر ہے

؎ اس پھول سے چہرے کو جو کوئی یاد کرے ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے

سراؔج کی غزلوں میں سوز و گداز' روانی اور کیف و سرور پایا جاتا ہے۔جذبے کی شدت اور خلوص کے سبب انکی شاعری میں رس و رعنائی ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں ہند ایرانی عناصر کو استعمال کیا۔ان کی غزلوں میں تصوف کی جھلک بھی پائی جاتی ہے سراؔج کہتے ہیں

راہ خدا پرستی اول ہے خود پرستی ہستی میں نیستی ہے نیستی میں ہستی

غزل 1 از: میر تقی میرؔ

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1) شعر:۔ کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں اس غم کدہ میں آہ دل خوش کہیں نہیں

حوالہ: یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مطلع میں میرؔ انسانی زندگی کی ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ایسا کوئی نہیں جو غموں میں مبتلا نہ ہو۔ ہر انسان کو زندگی میں دکھ درد، مشکلات، پریشانیوں، مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا دارالعمل ہے۔ یہاں ابدی چین وسکون نہیں ہے۔ اس لئے شاعر اس دنیا کو غم کدہ کہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس غموں سے بھری دنیا میں کوئی خوش نہیں یہ شعر میرؔ کی آپ بیتی بھی ہے۔ میرؔ نے ساری زندگی دکھ درد میں گذاری تھی اس لئے انہوں نے اپنے غم ذات کو غم کائنات بنا کر پیش کیا۔ میرؔ نے غموں کا لا متناہی سلسلہ دیکھا تھا اس لئے وہ دوسروں کی زندگی میں آنے والی عارضی خوشیوں کو بھی نہیں دیکھ سکے۔ درحقیقت ان کو اس جہاں میں ابدی خوشی حاصل نہیں ہے۔ انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کی خوشی آخرت میں جنت میں حاصل ہوگی۔ جہاں غموں کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور دیدار الٰہی کے ساتھ انسان ابدی خوشی حاصل کرلے گا۔

مرکزی خیال:۔ دنیا دارالعمل ہے یہاں غم زیادہ اور خوشی کم ملتی ہے شاعر کی زندگی کا غم اسے ساری دنیا کو غم میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے۔

2) شعر:۔ کرتا ہے درد دعوے دریا دلی عبث دامن نہیں مرا تو میری آستین نہیں

حوالہ: یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر غموں کا شکوہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ درد کا یہ دعوی غلط ہے کہ وہ دریا دل ہے اور وہ جنکی جھولی میں چاہے جا گرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا دامن اور آستین میرے سامنے ہیں لیکن درد اپنی دریا دلی کے دعوے کے باوجود میرا حصہ نہیں بن سکا۔ میرؔ نے اپنی زندگی میں اتنے غم سہے تھے کہ وہ خوشی بھول گئے تھے۔ غم سہتے سہتے غموں کے عادی ہو گئے تھے اس لئے وہ بہت زیادہ غموں کی کیفیت کے زمانے میں غموں سے شکوہ کرتے ہیں کہ میرا دامن اور میری آستین درد غم سے کیوں خالی ہیں۔ درد غم کی تمنا و شکوہ کرتے ہوئے میرؔ خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ اس نے ان کی قسمت میں ہی مسائل درد و غم کیوں لکھے ہیں۔

مرکزی خیال:۔ درد غم کی کثرت نے شاعر کو غم سہنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اس لئے شاعر دریا دل غموں سے شکایت کر رہا ہے کہ اگر وہ دریا دل ہیں تو میرا دامن اور میرا آستین غموں سے کیوں خالی ہے۔

3) یہ درد کیونکہ اس کے کروں دلنشین کہ ہیں کہتا ہوں جس طرح سے کہے ہے نہیں نہیں

حوالہ: یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر اپنے درد و غم چھپانے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ شاعر شدید درد و غم میں مبتلا ہے وہ اپنے دکھ درد میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی کو اپنے دکھوں کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے۔ اس لئے جب کوئی بھی اس سے اس کے دکھوں کے بارے میں

دریافت کرتے ہیں تو وہ دکھ درد نہ ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں وہ شدید غم میں مبتلا رہتا ہے۔ شاعر غم میں مبتلا اور غم نہیں ہے کہہ رہا ہے اس کے باوجود اس کی ظاہری حالت بتا رہی ہے کہ وہ مصیبت کا مارا ہے اور اُسے چین وراحت کی ضرورت ہے۔

مرکزی خیال: مصیبت زدہ لوگ صبر کرتے ہوئے غموں کو چھپاتے ہیں لیکن ان کے غم چھپانے کے دوران بھی آشکار ہو جاتے ہیں۔

4) شعر:۔ ماتھا کیا میں صرف سجود در بتاں مانند ماہ نو کے مرے رب جبیں نہیں

حوالہ: یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر کی خدا سے شکایت کا ذکر کیا گیا ہے شاعر کہتا ہے کہ میں نے ساری زندگی صرف تیری اطاعات اور تابعداری میں' تیری عبادت میں گذار دی۔ لیکن کیا بات ہے کہ میری زندگی میں وہ خوشحالی چین وسکون نہیں کہ جس کا اظہار میرے چہرے کی چمک سے ہوتا۔ میرا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح نہیں چمکتا' میں اس نئے چاند کی طرف عبادت گذار نہیں ہوں جو کہ کچھ دیر چمکنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بلکہ میں نے ہمیشہ تیری بندگی واطاعت کی ہے پھر کیا بات ہے کہ خدا میرے حصہ میں خوشحالی نہیں آئی بندے کی خدا سے شکایت خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ہے۔

مرکزی خیال:۔ بندہ صرف خدا کی عبادت کرتا ہے لیکن اس کا بھلا نہیں ہوتا۔ وہ عارضی عبادت گذار نہیں بلکہ مستقبل عبادت کرتا ہے۔ اس لئے اُسے خدا کی رحمتیں ملنی چاہئے۔

5) شعر:۔ گھر گھر ہے ملک عشق میں دوزخ کی تاب وتب بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش وہیں نہیں

حوالہ: یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس میں شاعر نے جذبہ عشق کی ہمہ گیری کو پیش کیا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ عشق کی وادی میں سبھی عشق میں مبتلا ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ وہ بھی عشق میں مبتلا ہیں اور جذبہ عشق کی آگ میں جل رہے ہیں۔ یہ وہ آگ ہے جو دوزخ کی آگ کی مانند گرم اور شدید ہے۔ اس موقع پر میرؔ شیخ کو متنبہ کر رہے ہیں کہ وہ عشق الہیٰ میں لوگوں کو مزید نہ بھڑکائے۔ کیونکہ یہاں سبھی اس جذبے سے سرشار ہیں۔ اس طرح شاعر اپنے عشق کے ساتھ دیگر لوگوں کی عشق کی کیفیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ کے زمانے میں ساری دلی تباہی و بربادی کا شکار تھی۔ لوگ دنیا سے مایوس ہو کر تصوف کی راہ اختیار کرنے لگے تھے اور میرؔ اپنے والد کے مشورے پر چلتے ہوئے بچپن ہی سے غم عشق میں مبتلا تھے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ مجھے عشق کا سبق پڑھنے یا پڑھانے کی ضرورت نہیں میں پہلے ہی اس میں مبتلا ہوں۔ یہ عشق حقیقی ہے جو ایک بندے کو خدا سے ہوتا ہے۔ جس میں بندہ اپنے آپ کو خدا کی یاد اور اس کی اطاعت کیلئے وقف کر دیتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ عشق کی آگ میں دوزخ کی سی گرمی ہے یہ آگ چاروں طرف لگی ہے اور شاعر بھی اس کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ دوسروں کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ وہ بھی اس آگ میں ڈوب جائیں۔

6) شعر:۔ فکر بلند سے میں کیا آسماں اُسے ہر یک سے میرؔ خواب ہو وہ یہ زمیں نہیں

حوالہ:۔ یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مقطع میں میرؔ اپنے کلام کی بڑائی پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے اعلیٰ افکار کے ذریعہ اپنی شاعری کو بلند مرتبہ پر پہنچایا ہے اور جہاں تک شاعری کا معاملہ ہے اس میں کوئی میری برابری وہمسری نہیں کر سکتا۔ میرؔ نے اپنے کلام میں جا بجا اپنی شاعری کے

معیار کے بارے میں بڑائی کا اظہار کیا ہے اور اس معاملے میں وہ غرور کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ میرؔ اپنے کلام کے اعلیٰ وارفع ہونے کا دعوی کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ اپنے عہد کے نامور شاعر تھے۔ لوگ ان کی غزلیں زبان یاد کر لیتے تھے اور اردو شعر و ادب کی تاریخ میں انہیں خدائے سخن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اپنے بارے میں تعریف و توصیف کے الفاظ استعمال کرنا میرؔ جیسے بلند شاعر کیلئے زیبا نہیں دیتا۔

مرکزی خیال:۔ میرؔ کو اپنی شاعری کے بہتر ہونے کا احساس ہے۔ اور وہ انائیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاعری میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔

سوال: میر تقی میرؔ کا تعارف بیان کیجئے؟

جواب: میر تقی میرؔ کا تعارف: میر تقی میرؔ (1722-1810) اردو غزل کے نامور شاعر گذرے ہیں۔ انہیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد علی متقی ایک صوفی بزرگ تھے۔ بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرؔ کی پرورش سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزوؔ کے گھر دہلی میں ہوئی۔ میرؔ کی طبعیت میں کافی نزاکت تھی وہ ماموں کے ساتھ نہیں رہ سکے اور زندگی بھر معاشی بدحالی کا شکار رہے اور اس کا شکوہ اپنی شاعری میں بھی کیا۔ میرؔ نے دہلی کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ آخری عمر میں لکھنوء منتقل ہوئے اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ میرؔ کا لکھنو میں انتقال ہوا اور وہی دفن ہوئے۔

میرؔ نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی شاعری کی۔ لیکن غزل میں نام کمایا۔ ان کے اشعار سادہ اور معنوں سے پُر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں غم کو پیش کیا۔ ان کی شاعری داخلی جذبات کے اظہار کی شاعری ہے۔ میرؔ کے 72 نشتر بھی مشہور ہیں۔ میرؔ کے اردو شاعری کے چھ دیوان اور فارسی شاعری کا ایک دیوان ہے۔ ذکر میرؔ اور تذکرہ نکات الشعراء ان کی نثری تصانیف ہیں۔

سوال:۔ میرؔ کی غزل میں غم والم کے عنصر کی اہمیت واضح کیجئے (یا) میرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کیجئے۔

جواب:۔ **میر تقی میرؔ** (1717-1810) اردو غزل کے شہنشاہ اور یاسیات کے امام کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے غزل میں سہل ممتنع کو رواج دیا نادر تشبیہات آسان محاورات سادہ سلیس انداز میں غزل گوئی کے ذریعے میرؔ نے شہرت حاصل کی۔ وہ دبستان دہلی کے نمائندہ شاعر ہیں۔ دہلی کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ترک وطن کر کے لکھنو گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ زندگی نامساعد حالات میں گذاری جس کا اثر انکے مزاج پر پڑا اور تمام عمر یاسیت اور غم کو زندگی کا حصہ بنایا۔

میرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

عشق پسندی اور خودداری نے انہیں خود سے اور زمانے سے بیگانہ بنا دیا۔ میرؔ عشقیہ شاعری ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اسکا بھرم رکھنے کیلئے درکار صبر و تحمل کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تلک آئے

میرؔ کی شاعری دل کے جذبات کی شاعری ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنی آپ بیتی میں سارے جہاں کا درد سمو دیا ہے۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کے صاحب ہم نے درد و غم کتنے جمع کئے تو دیوان کیا

انکی شاعری میں احساس کی گرمی اور درد کی شدت ہے انہوں نے دلی کی تباہی کے مناظر بھی اس طرح پیش کئے کہ دل اور دلی دونوں

مرکزی مقام حاصل کر گئے۔اردو کے اکثر نقاد میرؔ کی شاعری کو میرؔ کی زندگی کا مرثیہ یا پھر دل اور دلی کے مرثیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

؂دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا ہے

میرؔ کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کو زوال آ گیا تھا۔اور مغل شہزادوں کے ساتھ زیادتی کی جا رہی تھی۔اسکا منظر بیان کرتے ہوئے میر کہتے ہیں۔ **؂شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی   انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں**

غزل کی شاعری کو میرؔ نے کوئی فلسفہ یا تصور تو نہیں دیا لیکن غزل کو نغمگی ایمائیت اور تشبیہ و استعارے کی ایک ایسی دنیا ضرور دی جس پر اردو غزل کی تمام تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔میرؔ نے شاعری کا جو انداز اختیار کیا وہ ان کا اپنا تھا دوسرا کوئی اس کی نقل نہیں کر سکا۔میرؔ کی غزل گوئی کو غالبؔ جیسے شاعروں نے عظمت کی نگاہ سے دیکھا میرؔ نے اپنی شاعری میں تشبیہوں کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

؂نازکی اس کے لب کی کیا کہئے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ کی شاعری میں ترنم بھی پایا جاتا ہے۔میرؔ نے اپنی غزلوں میں لفظوں کی تکرار کے ذریعہ ترنم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

؂ پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میر تقی میرؔ نے طویل بحروں میں اپنے جذبے کی شدت کو پھیلا کر اور مختصر بحروں میں جذب کر کے ایک سریلا اور دھیما پن پیدا کیا ہے۔جس کو عام طور پر گیتوں کے مزاج سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔میرؔ کی شاعری دل اور دلی کی علامتوں کی مظہر ہے دل انسان کا وہ مرکز ہے جسکے آئینہ میں میرؔ زندگی اور کائنات کا جلوہ دیکھتے ہیں اور دلی اس تہذیب کا دل ہے جو مٹ رہی ہے دل اور دلی کے افسانے ان کی شاعری کو اٹھاوریں صدی کی روح کا ترجمان بنا دیا۔میرؔ کی شاعری میں تشبیہات کی چستی لفظوں کی صناعی انداز کی بے ساختگی اور نازک خیالی پائی جاتی ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

محمد حسین آزادؔ نے آب حیات میں میرؔ کے 72 کے نشتروں کا ذکر کیا ہے۔میرؔ صرف اپنے دور کے شاعر نہیں بلکہ انہوں نے اپنے اشعار سے مستقبل کے اشارے بھی کئے۔

؂جانے کا نہیں شور سخن کا میرے ہرگز   تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

میرؔ نے غم کو اپنے گلے سے لگایا ان کا خیال تھا کہ دنیا کا مال و دولت کسی سے مانگا جا سکتا ہے لیکن غم کسی سے مستعار لینا نہیں چاہئے۔میرؔ نے اپنی زندگی کی عکاسی کیلئے شعر کو وسیلہ بنایا ان کی شاعری میں داخلی کرب جھلکتا ہے۔میرؔ کی شاعری انکی زندگی کی کڑواہٹوں ناامیدیوں اور ناکامیوں کی داستان ہے۔ **؂جو اس شور سے میرؔ روتا رہیگا   تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہیگا**

؂ عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند

یعنی رات بہت جاگے صبح ہوئی آرام کیا

میرؔ کا غم آفاقی غم تھا اس لئے آج بھی ہر غم زدہ میرؔ کی شاعری میں اپنا غم تلاش کرتا ہے۔ بلا شبہ میرؔ کی شاعری ادب عالیہ میں بلند مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو جذبات کے موزوں اظہار اور غم و یاسیت کے احساسات سے مالا مال کیا۔ اور زبان و بیان تشبیہ و محاورے صنائع و بدائع کے ایسے دفتر کھولے کہ جس سے اردو شاعری کے ذخیرے میں کئی اضافے ہوئے غزل کے پیرائے بیان کو میرؔ نے جس دھیمے پن اور سنجیدگی سے وابستہ کیا اس کی ہمسری غزل کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کرسکتا میرؔ کی اس خصوصیت کی وجہ سے انہیں ''خدائے سخن'' کا درجہ دیا جاتا ہے۔

غزل 1 از: خواجہ حیدر علی آتشؔ

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1) شعر:۔ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتشؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مطلع میں آتشؔ اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے غیاب میں لوگ تیرے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ اس جانب توجہ دینا چاہئے کیونکہ لوگوں نے شاعر کے بارے میں فسانے کھڑے کردیئے تھے عام طور پر لوگوں کو نفسیات ہوتی ہے کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرتے ہیں۔ شاعر اپنا محاسبہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شائد میں برا ہوں۔ اس لئے میرے پیچھے لوگ میری برائیاں کررہے ہیں یہ میرے برے کاموں کا قصہ بیان کررہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے شاعر اپنا احتساب کرنا چاہتا ہے۔ اگر شاعر نے اچھے کام کئے ہوں تو اُسے یہ اطمینان ہوگا کہ لوگ اس کے غیاب میں اس کی تعریف کررہے ہیں لیکن اس طرح کم ہی ہوتا ہے۔ انسان کو اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ ایسی زندگی گذارے کہ لوگ اس کی غیر موجودگی میں تعریف کریں۔ اور اگر پتہ چل جائے کہ اس کی غیر موجودگی میں لوگ اس کی برائی کررہے ہیں تو انسان کو برائی ترک کرتے ہوئے اپنی زندگی کو بہتر بنانا چاہئے۔

مرکزی خیال:۔ انسان کو تھوڑی دیر کیلئے یہ فکر کرنا چاہئے کہ اس کی غیر موجودگی میں لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں یا برائی بیان کرتے ہیں۔ اگر تعریف کرتے ہیں تو اسے مزید نیک بننا چاہئے اور اگر برائی کرتے ہیں تو انسان کو اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔

2) شعر:۔ زیر زمین سے آتا ہے جو گل زر بکف قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کو

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتشؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں آتشؔ کہتے ہیں کہ زمین کا سینہ چیر کر اک ننھا پودا باہر نکلتا ہے اور اس پودے پر لگنے والا پھول ہیرے کی طرح چمکتا ہے۔ زمین سے اُگنے والے پودے ایسے ہیں جیسے زمین سے قارون کا خزانہ نکل رہا ہو۔ جو زمین زرخیز ہوتی ہے وہ اچھی فصل کی شکل میں خزانہ اُگلتی ہے۔ اس لئے زمین سے نکلنے والی پیداوار کو بھی دولت و خزانہ کہا جاتا ہے۔ زمین سے نکلنے والا خزانہ جو پیداوار کی شکل میں ہوتا ہے وہ بھی انسانوں کیلئے ضروری ہے۔

مرکزی خیال:۔ زمین سے اگر پیداوار اچھی ہو تو اُسے خزانہ تصور کیا جاتا ہے۔

3) شعر:۔ زینہ صبا کو ڈھونڈتی ہے اپنی مشت خاک بام بلند یار کا ہے آستانہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں آتش کہتے ہیں کہ انسان کی حقیقت مٹی کے برابر ہے لیکن انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی سوچ میں ہوئے ترقی کرنا چاہتا ہے لیکن انسان کو بلند اونچا مقام و ترقی یوں ہی نہیں ملتی اس کیلئے اسے سخت محنت کرنا پڑتا ہے۔ سخت محنت کے ساتھ انسان میں ترقی کے عزائم بھی ہونے چاہئیں اگر اس کے اندر عزم و حوصلہ نہ ہو تو وہ نہ ترقی کی سوچ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔ اس لئے اسے ترقی کا عزم کرتے ہوئے جہد مسلسل کے ساتھ اپنی منزل حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

مرکزی خیال:۔ انسان کو ترقی کی راہیں کھوجنا چاہئے اور سخت محنت کے ساتھ منزل حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

4) شعر:۔ طلب و علم ہے پاس نہ اپنے ہے ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا!

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں آتش اپنا حال بیان کرتے ہوئے عام انسانوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ نہ میرے پاس علم ہے نہ مال و جائیداد ہے۔ اگر لوگ مجھ سے مخالفت کریں یا جھگڑا کریں تو کس وجہ سے کریں گے۔ دنیا میں اکثر جھگڑے مال و جائیداد کی بنا ہوتے ہیں۔ اور خدا نے مجھے دولت سے دور رکھا ہے۔ شاعر اک طرف اپنی غربت کا اظہار کر رہا ہے تو دوسرا طرف خدا سے شکوہ کر رہا ہے کہ مجھے علم و مال دولت عطا نہیں کیا۔ اس لئے میں ہر طرح سے مفلس ہوں میری مفلسی مجھے دنیا کے جھگڑوں سے بچائے رکھتی ہے لیکن اے خدا دوسرے لوگوں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میں مال و دولت و جائیداد والا ہو جاؤں۔

مرکزی خیال:۔ جائیداد و مال مخالفتوں کو دعوت دیتے ہیں۔ مفلس انسان دنیا والوں کے لڑائی جھگڑوں سے محفوظ رہتا ہے۔

5) شعر:۔ آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں آتش اپنی موت کے بہانے کو یاد کر رہے ہیں۔ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ دنیا کی اٹل حقیقت ہے لیکن اکثر موت کسی بہانے ک یذریعہ آتی ہے۔ کبھی حادثے کی شکل میں، کبھی بیماری کی شکل میں۔ شاعر کو احساس ہے کہ اس نے عمر کا ایک طویل حصہ بھی جی لیا ہے۔ اب اس دنیا سے اس کے چل چلاؤ کا وقت قریب ہے۔ وہ منتظر ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ موت کس بہانے سے اُسے لے جاتی ہے۔

مرکزی خیال:۔ انسان کو موت اکثر کسی سبب اور بہانے کے ساتھ آتی ہے اور شاعر انتظار کر رہا ہے کہ خدا نے اس کی موت کس بہانے کے ساتھ رکھی ہے۔

6) شعر:۔ بے تاب ہے کمال ہمارا دل حزیں مہمان سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں آتش اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا جسم اس دنیا کے مہمان سرائے میں مزید چند دنوں کا مہمان

ہے۔ پتہ نہیں کب موت کا بلاوا آ جائے اور کب اس دنیا کو چھوڑ کر جانا پڑے۔ میں نے اس دنیا میں جو کچھ کام کیا ہے وہ انتہا کو پہنچ گیا ہے اب دل مغموم ہے کیونکہ ہمیں اس دنیا کو چھوڑنا ہے اور جب انسان کو دنیا کے بجائے آخرت کی فکر ہو جاتی ہے اور خدا سے ملنے کی آرزو بڑھ جاتی ہے تو اس کا اس دنیا کی رنگینی میں دل نہیں لگتا وہ دنیا کو عارضی ٹھکانہ سرائے سمجھتا ہے اور اُسے چھوڑنے کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ انسان کیلئے دنیا عارضی ٹھکانہ ہے اور اسے ایک نہ ایک دن اپنے ہنر اپنے کمال کو چھوڑ کر جانا ہے۔ جب دنیا چھوڑنا طئے ہے تو جہاں جانا ہے وہاں کی تیاری کر لینا چاہئے۔

7) **شعر:۔ یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا**

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مقطع میں شاعر آتش اپنی شاعری کی بڑائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے جذبہ عشق میں ڈوب کر غزل کہی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے حسد کرے اور حسد کے جذبہ کے تحت میری غزل پر مجھے داد نہ دے کوئی بات نہیں لیکن مجھے اطمینان ہے کہ میں نے شاہکار غزل کہی ہے۔ شاعر یہ کہتے ہوئے اپنی شاعری کی اہمیت واضح کر رہا ہے۔ اور سامعین کی برائی کر رہا ہے اردو شعراء نے اکثر اپنی شاری کی تعریف خود کی ہے۔

مرکزی خیال:۔ لوگ شاعر کے کلام کی تعریف کریں یا نہ کریں شاعر کو اطمینان ہے کہ اس نے اچھا کلام پیش کیا ہے۔

غزل 2 از: خواجہ حیدر علی آتش

سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

1) **شعر:۔ خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری**

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مطلع میں آتش صوفیانہ خیالات پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ دل خوش ہے جس میں خدا سے ملنے کی آرزو ہوتی ہے اور وہ دماغ بہتر ہے جس میں خدا کی یاد تازہ ہو۔ اس طرح شاعر ان لوگوں کو خوش قسمت قرار دیتا ہے جن کے دل و دماغ ہمیشہ اپنے مالک حقیقی خدا کی یاد میں ڈوبے رہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خدا کی یاد سے انسان کو حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے دل و دماغ فرحت وانبساط کے احساس کے ساتھ سکون وراحت محسوس کرتے ہیں۔ انسان کا حقیقی چین وسکون خدا کی یاد میں مضمر ہے۔

مرکزی خیال:۔ انسان کے دل و دماغ میں خدا کی یاد چھائی رہے تو دل و دماغ کے ساتھ وہ انسان بھی حقیقی چین وسکون حاصل کر سکتا ہے۔

2) **شعر:۔ یقین ہے اٹکے گی جاں اپنی آ کے گردن میں سنا ہے جا ہے قریب رگ گلو تیری**

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر موت کی تکلیف میں آسانی کی امید ظاہر کرتا ہے۔ نزع کا عالم شروع ہو جاتا ہے تو جان بڑی تکلیف سے نکلتی

ہے۔انسان کی روح نکلتے نکلتے گردن کے پاس اٹک جاتی ہے لیکن شاعر کو پتہ ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے قریب ہوتا ہے نزع کے عالم اور موت کی تکلیف کے وقت خدا کی قربت یقیناً انسان کو موت کا مزہ چکھنے میں آسانی پیدا کر دیتی ہے شاعر اس طرح کے خیالات پیش کرتے ہوئے مشکل اوقات میں خدا کی مدد کا طلب گار ہے۔انسانی زندگی پیدائش سے لے کر موت تک مساء میں گھری رہتی ہے انسانی مسائل کا حل خدا کی مدد میں چھپا ہے۔اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر مسئلہ کے حل کیلئے خدا سے مدد طلب کرے۔

مرکزی خیال:۔ انسان خدا کو حاضر و ناظر جانے تو زندگی کے تمام مسائل کے حل کے ساتھ اس کی موت کی آسانی کا مسئلہ بھی حل ہوسکتا ہے۔

3) شعر:۔ پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال تلاش کی ہے صنم ہم نے چار سو تیری

حوالہ:۔یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔اس شعر میں خدا کی پہچان کی کوشش کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو کائنات کی ہر شئے اور مخلوق سے خدا کی قدرت جھلکتی ہے۔آسمان، سورج، چاند، تارے، پہاڑ، ندی، نالے، چھوٹی بڑی مخلوقات میں اگر غور کیا جائے تو خدا کی قدرت جا بجا بکھری نظر آتی ہے۔بغیر سہارے ٹھہرا یہ وسیع و عریض آسمان، زمین سے بڑا ہر ستارہ اور آسمان پر موجود بے شمار ستارے، جگنو، تتلی، چھوٹے بڑے جانور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا خالق بڑی طاقت اور قدرت والا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان خدا کی ذات میں غور کرنے کے بجائے اس کی پیدا کردہ مخلوقات میں غور کرے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے جو بڑی قدرت والا ہے۔اور انسان کو اسی کی عبادت کرتے ہوئے اُسی سے مدد طلب کرنا چاہئے۔

مرکزی خیال:۔ کائنات کے چاروں طرف خدا کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں اگر انسان غور کرے تو اُسے ہر ذرے میں خدا نظر آئے گا۔اس طرح کی نظر پیدا کرنے کیلئے انسان کو خدا کی یاد میں ڈوبا رہنا چاہئے۔

4) شعر:۔شب فراق میں اک دم نہیں قرار آیا خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں خدا کی یاد میں شاعر کی بے قراری کا ذکر کیا گیا ہے۔آتش کہتے ہیں کہ خدا کا سچا عاشق بندہ اپنے محبوب خدا سے ملنے کیلئے بے چین ہے اس کا دن تو زندگی کے ہنگاموں میں کسی طرح گذر ہی جاتا ہے لیکن جب وہ رات میں تنہا ہوتا ہے تو خدا سے دوری کے سبب وہ بے چین ہو جاتا ہے۔اپنی اس کیفیت کے ثبوت کے طور پر وہ اپنی آرزو اور خدا کو گواہ بناتا ہے کہ میری آرزو اس بات کی گواہ ہے کہ میں خدا سے دوری کے سبب اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہوں اور خدا تو دل کا حال جاننے والا ہے۔وہ بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ عاشق بندہ اس سے ملنے کیلئے اس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ شاعر خدا کی یاد میں ڈوبے رہنے کیلئے اپنی آرزو اور خود خدا کو گواہ بناتا ہے۔اس طرح وہ خدا کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

5) شعر:۔دماغ بھی اپنا اے گل بند معطر ہے صبا ہی کے نہیں حصہ میں آئی بو تیری

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں خا کا عرفان شاعر کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے۔آتش کہتے ہیں کہ اے خدا تیری ذات کا عرفان ساری کائنات کی ہر شئے کو حاصل ہے۔ ہوا جب چلتی ہے تو وہ خدا کی تعریف کرتی ہے۔شاعر ہوا سے کہتا ہے کہ اے صبا تو ہی گلوں کی بو ہی نہیں سونگھتی اور معطر رہتی ہے۔ بلکہ انسان بھی پھولوں کی بو سونگھتا ہے۔اور اس سے اپنے دل و دماغ کو معطر رکھتا ہے۔ پھول خدا کی مخلوق ہے ہوا پھول کی خوشبو کیلئے پھرتی ہے یعنی خوشبو کی شکل میں خدا کی تجلی کو لئے پھرتی ہے انسان خوشبو کو سونگھ کر دل و دماغ معطر کرتا ہے اور وہ بھی خوشبو کے ذریعہ خدا کی مخلوق کو اور بالواسطہ طور پر خدا کو محسوس کرتا ہے اور اس بات پر فخر کرتا ہے کہ ہوا کے ساتھ اُسے بھی خدا کی ذات کا عرفان حاصل ہے۔

مرکزی خیال:۔ کائنات کے تمام جاندار اور مخلوق اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل کرتے ہوئے خدا کا حکم بجالاتے ہیں۔انسان کو بھی خدا کو پہچاننا چاہئے اور اس کی اطاعت کرنا چاہئے۔

6) شعر:۔ پڑھا ہے ہم نے بھی قرآن، قسم ہے قرآن کی جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں کلام مجید قرآن کی عظمت بیان کی گئی ہے شاعر کہتا ہے کہ میں نے قرآن پڑھا ہے اور شاعر قرآن کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کلام کا اعجاز ہی کچھ اور ہے۔کفار نے جب حضور اکرم ﷺ کی زبانی قرآن سنا تو ابتداء میں وہ قرآن کو انسانی کلام کہنے لگے جب قرآن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو چیلنج کیا کہ یہ کلام الہیٰ ہے تم لوگ پورا قرآن تو کیا قرآن کی جیسی ایک آیت بھی اپنی طرف سے پیش نہیں کر سکتے کیونکہ یہ انسانی کلام نہیں بلکہ خدائی کلام ہے۔شاعر قرآن کریم کے عجیب وغریب انداز تخاطب پر حیرت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کلام کا کوئی جواب ہی نہیں۔اسی طرح شاعر کلام ربانی کی تعریف کرتے ہوئے انسانوں کو قرآن کی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنے اُس پر عمل کرنے اور ان تعلیمات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت کی طرف بھی شارہ کرر ہا ہے۔

مرکزی خیال:۔ قرآن کلام الہیٰ ہے انسان اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے قرآن کے انداز گفتگو سے متاثر ہو کر انسان کو اپنے خدا سے تعلق کو مزید مضبوط کر لینا چاہئے۔

7) شعر:۔ یہ گردش فلک پیر سے ہوا ثاب قویٰ ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں خدا سے تعلق جوڑنے میں انسان کی کامیابی کو ظاہر کیا گیا ہے۔آتش کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم سے اب تک کے حالات پر نظر ڈالی جائے۔انسانوں اور قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ پڑھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں خدا کی یاد اور اس سے وابستگی نے کمزور وناتواں انسانوں اور قوموں کو کامیابی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔انسان اپنے مسائل کے حل کرنے میں کسی کی مدد کا محتاج ہے اور انسان کے بشمول دیگر تمام مخلوقات کے مسائل کا حل رب العالمین خدائے وحدہ لاشریک کے پاس ہے۔انسان اگر خدا سے مدد طلب کرے اور اپنے آپ کو خدا اور اس کے رسول ﷺ سے جوڑ لے تو انسان کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور مسائل کے حل میں مجبور و ناتواں کمزور انسان کامیابی حاصل کرنے کے بعد خود کو توانا اور کامیاب محسوس کرتا ہے۔انسان کو یہ کامیابی اپنی عقل اور صلاحیت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور اس کی مدد کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔جو انسان اپنے آپ کو کمتر بنا کر عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے اللہ اس کی ضرور مدد کرتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانے میں خدا سے مدد طلب کرنے والے کامیاب رہے ہیں اور کمزور و ناتواں ہونے کے باوجود خدا کی جستجو کرنے سے انہیں قوت و طاقت حاصل ہوئی اور کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔

8) شعر:۔ زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں سیف زبان رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

حوالہ:۔ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

تشریح:۔ غزل کے مقطع میں شاعر اپنی شاعری کی خوبی و بڑائی بیان کرتا ہے۔ آتش کہتے ہیں کہ میری شاعری تلوار کی دھار کی طرح تیز ہے۔ جس طرح تلوار کا وار سیدھا نشانے پر لگ کر کسی کا کام تمام کر دیتا ہے۔ اسی طرح میرے اشعار بھی سننے والوں کے دلوں پر سیدھے اثر کرتے ہیں۔ اگر میرے خیالات سے کسی کو تکلیف پہنچے تو بدلے میں لوگ مجھے بے عزت کریں گے اور میری عزت و نیک نامی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن لوگوں کے ڈر سے میں اپنے کلام کی تیزی اور چبھن کم نہیں کروں گا۔ شاعر اپنے تیز و ترش رویے سے آگاہ ہے۔ انسان کی فطرت اچانک نہیں بدلتی۔ اور اس کے خیالات لفظوں کے ذریعہ اشعار میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ آتش اپنے کلام کو پر اثر قرار دیتے ہوئے اپنے دور کے شعراء میں اپنے آپ کو ممتاز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مرکزی خیال:۔ شاعر کو احساس ہے کہ اس کے کلام میں تلوار کی سی تاثیر ہے۔ تاہم اسے ڈر ہے کہ اس کے کلام کی تیزی سے لوگ اس کی مخالفت پر اتر آئیں گے۔ اس کے باوجود شاعر اپنے ترش رویے کو بدلنے تیار نہیں ہے۔

سوال: خواجہ حیدر علی آتش کا تعارف پیش کیجئے؟

جواب: خواجہ حیدر علی آتش (1846 -1778) اردو کے نامور غزل گو شاعر گذرے ہیں۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ کمسنی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ شاعری میں مصحفی کے شاگرد رہے۔ بعد میں خود استاد شاعر بن گئے۔ ان کے شاگرد دولت مند تھے لیکن انہوں نے کسی سے مدد طلب نہیں کی۔ لکھنو کے بادشاہ کی طرف سے انہیں اسی روپئے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ جس میں سے پندرہ روپے اپنے لئے رکھ کر باقی رقم غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ بھنگ پینے کا شوق زندگی بھر رہا۔ آخری زمانے میں بینائی سے محروم ہوئے اور لکھنو میں انتقال کیا۔ آتش دبستان لکھنو کے نامور شاعر تھے۔ انہوں نے زبان کی صفائی پر توجہ دی اور محاورات کا بہترین استعمال کیا۔ ان کے کلام میں روزمرہ کا لطف ملتا ہے۔ شوخی اور رنگینی بھی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

نظم: توحید از: نظیر اکبر آبادی

سوال: نظم کی تعریف کیجئے۔

جواب: نظم کی تعریف: اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں کسی ایک خیال کو تسلسل سے بیان کیا جائے اسے نظم کہتے ہیں۔ نظم کے لغوی معنیٰ ''لڑی میں موتی پرونے'' کے ہیں۔ تنظیم، ترتیب، نظم و ضبط کے مفاہیم میں بھی اس لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم پورے ادب کو نظم و نثر میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح پوری شاعری کو ہم غزل اور نظم میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ نظم کے محدود تر اور جدید تر معنی ہیں۔ ادب میں جب نظم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی نثر کے مخالف مفہوم کے ہوتے ہیں۔ اور اس میں ان ساری اصناف کو شامل کر لیا جاتا ہے۔ جو نثر میں نہیں ہیں۔ جیسے

مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، رباعی، نظم وغیرہ۔ گویا لفظ ''نظم'' وسیع تر معنوں میں ساری شاعری کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن بطورِ اصطلاح اس لفظ کے معنی کسی خاص عنوان، ترتیب اور تسلسل کے ساتھ شاعری میں اظہارِ خیال کے ہیں۔ نظم میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور معنوی سطح پر اس میں ارتقاء بھی ضروری ہے۔ نظم میں تسلسل اور تاثر بھی ہونا چاہیے۔ نظم کیلئے نہ تو ہیت کی قید ہے اور نہ موضوعات کی اور نہ اشعار کی۔ چنانچہ اُردو شاعری میں مختلف ہیئتوں اور مختلف موضوعات پر نظمیں کہی گئی ہیں جیسے مخمس، مسدس اور غزل کی ہئیت میں۔ نظم میں اشعار کی تعداد بھی مختلف رہی ہے۔ نظم کی چار قسمیں مشہور ہیں۔ پابند نظم۔ معریٰ نظم۔ آزاد نظم اور نثری نظم۔ لیکن پابند نظم میں بحر اور قافیہ وغیرہ تک ترتیب اور پابندی ضروری ہے۔ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے آزاد اور مکمل ہوتا ہے۔ جبکہ نظم میں ایک شعر دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ غزل میں موضوعی اعتبار سے کثرت ہوتی ہے لیکن نظم میں وحدت۔ نظم کے اشعار موضوع اور خیال کے اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں یہ وہ صنف سخن ہے جو غزل کے مقابل ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ اور جسکی مثالیں ہمیں محمد قلی قطب شاہ سے لے کر عہد حاضر تک بہ کثرت ملتی ہیں۔ پابند نظم کے مشہور شعرا میں قلی قطب شاہ، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، اقبال، حالی، چکبست، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم، جان نثار اختر، اختر الایمان وغیرہ مشہور ہیں۔

جدید نظم گو شعراء میں تصدیق حسین خالد، میراجی، فیض احمد فیض، مجید امجد، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اختر الایمان، قاضی سلیم، کمار پاشی، بلراج کومل، عزیز قیسی، وحید اختر، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت قابل ذکر ہیں۔ نظم معری اور آزاد نظم کے بعد جدید اردو شاعری میں نثری نظم کا بھی تجربہ ہوا۔ جس میں کسی بحر کی پابندی نہیں ہوتی بلکہ صرف آہنگ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نثری نظم ابھی تجرباتی مراحل میں ہے۔

سوال: نظم ''توحید'' کا خلاصہ لکھئے۔ (یا) نظیر نے نظم ''توحید'' کے ذریعے خدا کی پہچان کے کیا طریقے بیان کئے ہیں۔

جواب: تعارف: سید محمد نظیر اکبر آبادی (1735-1830) اردو کے مشہور نظم گو شاعر گذرے ہیں دہلی میں پیدا ہوئے بعد میں اکبر آباد آگرہ میں منتقل ہو گئے اور ساری زندگی وہیں گذار دی۔ نظیر سپاہ کے رسیا تھے وہ عرسوں اور جاتراؤں میں شرکت کرتے اور زندگی کے مشاہدات کو نظموں میں بیان کرتے تھے وہ فطری شاعر تھے۔ ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عوامی زبان استعمال کی۔ ان کی مشہور نظمیں آدمی نامہ، بنجارہ نامہ وغیرہ ہیں۔ ان کی ایک نظم ''توحید'' ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ نظم:۔ نظیر نے نظم توحید عشرہ کی ہیئت میں لکھی ہے۔ نظم کے ہر بند میں دس مصرعے ہیں اس نظم میں نظیر نے اظہار خیال کی صلاحیت سے استفادہ کرتے ہوئے توحید کے موضوع کو وسیع تر انداز میں سمجھایا ہے۔ نظم کے پہلے بند میں نظیر خدا کی وحدانیت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ خدا کو ہم صرف اپنے دل میں موجود نہیں سمجھنا چاہے بلکہ اُسے کائنات کے ہر رنگ میں محسوس کرنا چاہئے۔ خدا اپنی ذات سے پوشیدہ ہے لیکن اپنی تخلیق کردہ کائنات کی ہر شکل وصورت سے اس کی قدرت عیاں ہے انسان کو خدا نے عقل دی اور کائنات کے مطالعہ کیلئے آنکھ، کان، زبان، ناک، ہاتھ وغیرہ دیئے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے حواس اور عقل کو استعمال کرے اور کائنات میں موجود بے شمار مخلوقات کو دیکھتے ہوئے خدا کی قدرت پہنچانے اسلئے نظیر لوگوں کو کہتے ہیں کہ خدا کو پیڑ، پودوں، پھل، پھول، پہاڑ، ندی نالے طرح طرح کے رنگوں خوشی اور غم، امن اور جنگ ہر حالت میں محسوس کرے۔ کیونکہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے بندہ خدا کا سچا عشق ہوتا ہے۔ اور ایک عاشق اپنے معشوق کے ظاہر سے اس کے باطن کو پہچانتا ہے۔

دوسرے بند میں نظیر کائنات کی چند اور مخلوقات کا ذکر کرتے ہوئے خدا کی قدرت اور توحید بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے پھل اور پھول ہیں وہ سب خدا کی پیداوار ہیں۔ اسی طرح لوگوں میں امیر، غریب، خوشحال، غمزدہ، ظالم، مظلوم لوگوں سے یہ اونچ نیچ بھی خدا کی

طرف سے ہے۔انسان اگر کائنات کے اس نظام میں غور کرے تو خدا کی قدرت محسوس ہوگی۔

نظم کے اگلے بند میں نظیر انسانی طبقات کے بیان کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ کچھ لوگ خوش ہیں اور کچھ لوگ پریشانی میں ڈوبے ہوئے ہیں کوئی روزگار کیلئے پریشان ہے تو کوئی دولت سے مالا مال ہے۔کوئی خوشی میں ہنستا ہے تو کوئی غم میں روتا ہے۔خوشحال لوگ اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور پریشان حال لوگ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔کوئی ناز ونخرے کرتا ہے تو کوئی اپنی غریبی کا ظہار کرتا ہے انسانوں کے بیچ اچھے اور برے کا فرق خدا کی طرف سے ہے اور ہر چیز اور ہر کیفیت میں بھی خدا کی مرضی شامل ہے۔خدا کے سچے عاشق بندے دنیا میں غور وفکر کرتے ہوئے خدا کی قدرت کو پہچان سکتے ہیں۔

نظم کے اگلے بند میں نظیر صفات کے اعتبار سے انسانوں کی مزید ترجیح بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگ مذہبی ہونے کا دکھاوا کرتے ہیں مسلمان قرآن ہاتھ میں لئے مسجد جاتے ہیں ہندو مندر جاتے ہیں۔کچھ لوگ مذہب سے دور عیش کی زندگی گذارتے ہیں اور کچھ لوگ خدا کی یاد میں روتے ہیں۔دنیا میں امیر' غریب' نیک' بد۔ظالم' مظلوم ہر قسم کے لوگ ہیں۔لوگوں کی اس تفریق پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اونچ نیچ خدا کی طرف سے ہے اور خدا کے سچے عاشق بندے دنیا میں غور وفکر کرتے ہوئے خدا کی قدرت کو پہچان سکتے ہیں۔نظیر بڑے مردم شناس واقع ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنی نظم توحید میں دنیا میں پائے جانے والے قسم قسم کے انسانوں کے مطالعہ کو پیش کیا ہے۔چنانچہ نظم کے اگلے بند میں وہ کہتے ہیں کہ لوگوں میں کوئی کسی کا دوست ہے تو کوئی دشمن۔کوئی خدا کا عرفان پانے کیلئے پہاڑوں میں بیٹھتا ہے تو کوئی جنگل جنگل پھر کر خدا کی یاد کرتا ہے۔کوئی اس دنیا سے مال و دولت چھوڑ کر جارہا ہے تو کوئی فنا ہونے والی دنیا میں مال و دولت جمع کرنے میں مصروف ہے۔کچھ لوگ ہیرے جواہرات لگے کپڑے پہن کر خوش ہوتے ہیں تو کچھ لوگ مٹی میں لوٹ کر اپنا غم ہلکا کرتے ہیں دنیا میں کوئی جوگی ہے تو کوئی بھوگی ہے۔جب غور کیا جائے تو انسان کی یہ تفریق خدا کی طرف سے ہے اور ہر لمحہ اسی کی مرضی سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے اور خدا کے سچے عاشق بندے دنیا میں غور وفکر کرتے ہوئے خدا کی قدرت پہچان سکتے ہیں۔

نظم کے اگلے بند میں نظیر نے دنیا میں پائے جانے والے مختلف موسموں اور حالات کی منظر نگاری کی ہے۔اور وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کہیں سردی ہے تو کہیں گرمی ہے کہیں بارش ہے تو کہیں سوکھا پڑا ہوا ہے۔جہاں خوشحالی ہے وہاں کے لوگ صحت منداور خوش ہیں۔جہاں پریشانی ہیقحط ہے وہاں دکھ درد ہے کہیں شادی کے گیت گائے جاتے ہیں۔کہیں کسی کے مرنے کا ماتم ہے۔دن رات کا بدلنا اور موسموں کا بدلنا زندگی میں خوشی کے بعد غم اور غم کے بعد خوشی کا آنا' یہ سب خدا کی طرف سے ہے اس طرح کائنات کی ہر گھڑی خدا کی مرضی سے چل رہی ہے اور خدا کے سچے عاشق بندے دنیا میں غور وفکر کرتے ہوئے خدا کی قدرت کو پہچان سکتے ہیں۔

نظیر نظم کے اگلے بند کے آگے کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی محنت کر کے دولت کماتا ہے تو کوئی بھیک مانگ کر گذارا کرتا ہے کوئی چوری کرتا ہے تو کوئی نشہ کر کے مست ہے۔لوگوں میں یہ تفریق خدا کی طرف سے ہے دنیا میں نیک و بد' جھوٹا' سچا کالا' خوشحال بدحال دنیا میں موسموں کا بدلنا خدا کی طرف سے ہے اس طرح غور سے دیکھا جائے تو یہ کائنات کا سارا نظام ایک خدا کے حکم سے چل رہا ہے اور خدا کے سچے بندے کائنات کے ہر ذرے اور تقدیر کے ہر فیصلہ میں خدا کی مرضی کو دیکھتے ہیں اور ایک خدا کی یاد میں لگ جاتے ہیں۔

مرکزی خیال:۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم توحید میں انسانوں میں مختلف اقسام' ان کی صفات اور کائنات کے بدلتے نظام کو بیان کرتے ہوئے واضح کیا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے انسان کو چاہئے کہ کائنات کا م طالعہ کرے اور اس میں خدا کی

قدرت کو پہچانے اور اسی خدا کی عبادت میں لگ جائے۔

مختصر سوال و جواب:

سوال: نظیر اکبر آبادی کا تعارف بیان کرو۔

جواب: سید محمد نظیر اکبر آبادی (1735-1830) اردو کے مشہور نظم گو شاعر گذرے ہیں دہلی میں پیدا ہوئے بعد میں اکبر آباد آگرہ میں منتقل ہو گئے اور ساری زندگی وہیں گذار دی۔ نظیر سپر سپاٹے کے رسیا تھے وہ عرسوں اور جاتراؤں میں شرکت کرتے اور زندگی کے مشاہدات کو نظموں میں بیان کرتے تھے وہ فطری شاعر تھے۔ انہیں اردو کا عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عوامی زبان استعمال کی۔ ان کی مشہور نظمیں آدمی نامہ، بنجارہ نامہ وغیرہ ہیں۔

سوال: نظم توحید میں نظیر نے خدا کی پہچان کا کیا طریقہ بتایا۔

جواب: نظم توحید میں نظیر نے انسان کو خدا کا عاشق قرار دیا اور خدا کو دلبر کہا اور لوگوں کی توجہ اس جانب دلائی کہ وہ کائنات کا مطالعہ کریں جہاں اللہ نے فطرت کے نظارے رکھے ہیں انسانوں میں اونچ نیچ رکھی ہے۔ امیری غریبی، بادشاہت، فقیری، دولت، غربت، طاقت، کمزوری سب اللہ کی طرف سے ہے دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ان تمام باتوں کا مشاہدہ کرے اور یہ سمجھے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہی ہے۔

سوال: نظم توحید کا مرکزی خیال کیا ہے۔

جواب: نظیر اکبر آبادی نے نظم ''توحید'' میں انسانوں میں مختلف اقسام، ان کی صفات اور کائنات کے بدلتے نظام کو بیان کرتے ہوئے واضح کیا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے امیری غریبی، دولت، عزت، شہرت، طاقت، غربت، بیماری، کمزوری، پریشانی سب اللہ کی طرف سے آتی ہے اور وہی انسان کو دکھ اور سکھ دیتا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ کائنات کا مطالعہ کرے اور اس میں خدا کی قدرت کو پہچانے اور اسی خدا کی عبادت میں لگ جائے۔

نظم:۔ مستقبل از: اکبر الہ آبادی

سوال: اکبر الہ آبادی کی نظم ''مستقبل'' کا خلاصہ لکھو (یا) اکبر الہ آبادی نے اپنی نظم ''مستقبل'' میں آنے والے زمانے کی کیسی تصویر پیش کی ہے۔

جواب: اکبر الہ آبادی کا تعارف:۔ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی (1846-1921) اردو کے مشہور طنزیہ شاعر گذرے ہیں۔ اکبر نے جس زمانے میں شاعری کی اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کو زوال آ گیا تھا۔ انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے۔ 1857ء کے بعد سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ لیکن مسلمان اسلامی تہذیب چھوڑ کر انگریزی تہذیب اختیار کرنے لگے تھے۔ اور ان کی مذہبی شناخت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اکبر نے اس بات کو محسوس کیا اور اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے برے اثرات سے واقف کروایا۔ اور اس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ سرسید نے جو کام مسلمانوں کی اصلاح کیلئے کیا اکبر نے وہی کام اپنی شاعری کے ذریعہ کیا۔ مسلمانوں کی تہذیبی اصلاح کی کوشش کی۔ اکبر کی ایک نظم کا نام ''مستقبل'' ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ نظم:۔اکبرالہ آبادی زمانہ شناس شاعر تھے۔انہوں نے ایک عالم اور ایک نباض کی طرح اپنے زمانہ کی شخصیتیں دیکھیں۔جب کہ ان کے عہد کے لوگ تیزی سے مغربی تہذیب وتمدن اختیار کررہے تھے۔زمانہ کی تیز رفتار ترقی کو دیکھتے ہوئے اکبر نے آنے والے مستقبل کی ایک خیالی تصویر نظم ''مستقبل'' میں پیش کی ہے۔اکبر کہتے ہیں کہ زندگی کے موجودہ طریقے ختم ہوجائیں گے اور آنے والے زمانے میں نئی تہذیب ہوگی۔اور لوگوں کے پاس زندگی گذارنے کے نئے نئے سامان ہوں گے۔اکبر کے زمانے میں مادی ترقی نہیں تھی انگریزوں کے لائے صنعتی انقلاب سے مشینیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ریل گاڑی آ گئی تھی لوگ ایک مقام پر خوشحال رہتے تھے۔فرصت زیادہ تھی اکبر نے جس مستقبل کا اشارہ کیا وہ اب حال ہے۔آج مادی ترقی بڑھ گئی ہے۔انسان زندگی میں مشینوں پر انحصار کررہا ہے۔انٹرنیٹ اور فون سے دنیا سمٹ گئی ہے کمپیوٹر زندگی کے شعبوں میں داخل ہوگیا ہے۔لوگوں کے پاس مصروفیت بڑھ گئی ہے اور فرصت ختم ہوگئی ہے۔اسی کے ساتھ پرانی اور اچھی قدریں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔آج اولاد کو ماں باپ سے ملنے کا وقت بھی نہیں رہا۔اکبر نے ایسے زمانے کی آمد کی بھنک پہلے ہی لگالی تھی۔اکبر کہتے ہیں کہ آنے والے زمانے میں لوگوں کو اپنی زیب وزینت کے اظہار کے نئے طریقے مل جائیں گے۔لباس، بالوں کی ترتیب اور انسان کے ظاہر میں بڑی تبدیلی آجائے گی۔آج فیشن کے نام پر عورتوں کا لباس تنگ اور کم ہورہا ہے۔اور مرد بھی بھڑکتے رنگوں کے لباس زیب تن کررہے ہیں۔بالوں کی بناوٹ ایسی ہوگئی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ عورت ہے یا مرد۔اس طرح نئے زمانے کا ڈھنگ ہی بدل گیا ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری میں مسلم خواتین کی بے پردگی پر طنز کیا ہے۔چنانچہ اس نظم میں بھی اکبر کہتے ہیں کہ آنے والے زمانے میں خواتین پردے کی پابندی نہیں کریں گے۔اور نہ ہی اپنے چہروں کو گھونگھٹ سے ڈھانپیں گی۔اکبر نے بے پردگی کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ آج شہروں میں زیادہ ہے اور دیہی علاقوں میں بھی اس کے اثرات رونما ہورہے ہیں۔بے پردگی سے معاشرے میں کئی برائیاں جنم لیتی ہیں۔اس لئے اکبر نے بے پردگی کا ذکر کرتے ہوئے ہر زمانے کی مسلم خواتین کو مکمل پردے کی پابندی کرنے پر زور دیا ہے۔اکبر آنے والے زمانے کے خطرات سے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ زمانے کی چال یہ خبر دیتی ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں بڑی تبدیلی ہوگی۔ملت اسلامیہ کے عقائد میں کمزور پیدا ہوگی اور دین کی باتوں کو بے دینی اور بے دینی کی باتوں کو دینی سمجھا جائے گا۔اکبر عقیدہ کے بارے میں راسخ انسان تھے۔

مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔اس کے حکم سے دنیا کا ہر کام ہوتا ہے۔انسان کو ظاہری یا باطنی ہر قسم کی عبادت اسی کیلئے کرنی ہے۔محمد الرسول اللہ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔آپ آخری پیغمبر ہیں آپ کا لایا ہوا دین قیامت تک باقی رہے گا اور اس پر چلنے سے دنیا کے لوگوں کی کامیابی ہے۔جو مسلمان صحابہؓ کے طریقوں سے ہٹ کر زندگی گذارے وہ اپنے عقیدے اور اپنے دین پر قائم نہیں رہیں گے۔اکبر نے عقائد میں بگاڑ کی جو بات کہی ہے وہ اب سامنے آچکی ہے حدیث کے مفہوم کے مطابق آج مسلمان کئی فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔اور ہر فرقہ اپنے آپ کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھ رہا ہے اور اکبر کے مطابق لوگوں کے عبادت کے طریقے بدل گئے ہیں۔

اکبر آگے کہتے ہیں کہ ہندوستان والے مغربی تہذیب وطرز زندگی اپنانے کی کوشش کریں گے لیکن یہ لوگ نہ مغربی ہوں گے نہ مشرقی اور ان کی زندگی مذاق بن جائے گی۔آج بیشتر ہندوستانی انگریزی طرز زندگی اپنانے کی کوشش میں نہ ہندوستانی ہورہے ہیں اور نہ انگریزی تہذیب والے۔لوگ قدیم زبان بھولنے لگیں گے۔اور انگریزی میں بات کرنے کو شان سمجھیں گے۔اکبر کے دور کے مطابق آج ہندوستانی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں عار محسوس کررہے ہیں اور انگریزی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے میں فخر اور وقار محسوس کررہے ہیں۔

دنیا میں شرافت کا معیار اور پیمانہ بدل جائے گا۔ پہلے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگوں کو شریف سمجھا جاتا تھا۔ آنے والے زمانے میں لوگوں نے جو کارنامے انجام دیئے تھے وہ کتابوں سے ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ مکمل طور پر بھلا دیئے جائیں گے۔ اور نئی نسل ان کے کارناموں سے ناواقف ہوگی۔ آج ہندوستان کی نئی نسل کو اپنے آباء واجداد کے کارنامے ویسے یاد نہیں جیسے ہونے چاہئے۔ اکبر کہتے ہیں کہ زمانے میں آنے والی اس انقلابی تبدیلی کا غم اور دکھ کسی کو نہیں ہوگا لوگ اپنی اپنی زندگیوں میں مست ہو جائیں گے اور جس میں ہوں اُسی میں رنگ جائیں گے۔ انہیں اپنی تہذیب اور شناحت کی کچھ پرواہ نہیں ہوگی۔ اکبر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے نظم ''مستقبل'' کے آخر میں کہتے ہیں کہ دنیا میں انقلابی تبدیلی آئے گی۔ لیکن اس تبدیلی کے وقت نہ اکبر ہوں گے اور نہ ان کے عہد کے لوگ۔ آنے والا زمانہ کتنا خطرناک ہوگا یہ اُسی وقت کے لوگ جان سکیں گے۔

مرکزی خیال:۔ اکبر نے اپنی نظم ''مستقبل'' میں آنے والے زمانے کا ایک خیالی تصور پیش کیا ہے۔ اور اپنے دور کی تہذیب کا ''نوشتۂ دیوار'' پڑھتے ہوئے انہوں نے آنے والے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی جو تصویر پیش کی وہ بہت حد تک سچ ثابت ہوئی۔ اس نظم کے ذریعہ اکبر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مادہ پرستی اور مغرب پرستی کے اس دور میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو اپنی مشرقی اور اسلامی تہذیب نہیں بھولنی چاہئے۔ اور اس پر سختی سے کاربند رہنا چاہئے۔ تب ہی ان کی ہر طرح کی کامیابی ممکن ہے۔

مختصر سوال و جواب

سوال: اکبر الہ آبادی کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی (1846-1921) اردو کے مشہور طنزیہ شاعر گذرے ہیں۔ وکالت کی تعلیم حاصل کی تھی اور منصف اور جج کے عہدے پر فائض رہے۔ اکبر نے جس زمانے میں شاعری کی اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کو زوال آ گیا تھا۔ انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے۔ 1857ء کے بعد سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ لیکن مسلمان اسلامی تہذیب چھوڑ کر انگریزی تہذیب اختیار کرنے لگے تھے۔ اور ان کی مذہبی شناخت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اکبر نے اس بات کو محسوس کیا اور اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے برے اثرات سے واقف کروایا۔ اور اس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ سرسید نے جو کام مسلمانوں کی اصلاح کیلئے کیا اکبر نے وہی کام اپنی شاعری کے ذریعہ کیا۔ مسلمانوں کی تہذیبی اصلاح کی کوشش کی۔ کلیات اکبر کے نام سے ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

سوال: اکبر کی نظم مستقبل کا مرکزی خیال کیا ہے۔

جواب: اکبر نے اپنی نظم ''مستقبل'' میں آنے والے زمانے کا ایک خیالی تصور پیش کیا ہے۔ اور اپنے دور کی تہذیب کا ''نوشتۂ دیوار'' پڑھتے ہوئے انہوں نے آنے والے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی جو تصویر پیش کی وہ بہت حد تک سچ ثابت ہوئی۔ اس نظم کے ذریعہ اکبر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مادہ پرستی اور مغرب پرستی کے اس دور میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کو اپنی مشرقی اور اسلامی تہذیب نہیں بھولنی چاہئے۔ اور اس پر سختی سے کاربند رہنا چاہئے۔ تب ہی ان کی ہر طرح کی کامیابی ممکن ہے۔

نظم: فنون لطیفہ۔ از: اقبال

سوال: اقبالؔ کی نظم ''فنون لطیفہ کا خلاصہ لکھو۔ (یا) اقبالؔ نے نظم ''فنون لطیفہ'' میں نوجوانوں سے کیا مطالبہ کیا ہے۔

جواب: اقبال کا تعارف:۔ شیخ محمد اقبالؔ (1873-1938) اردو کے عظیم مفکر شاعر گذرے ہیں۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی اور وطنی جذبہ کو ابھارا۔ خودی عشق اور حرکت و عمل کے فلسفے کو انہوں نے فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔ اقبالؔ مرد مومن میں ان صفات کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ پیغمبری کی۔ اقبالؔ کے شعری مجموعے بانگ درا' بال جبرئیل' ضرب کلیم اور ارمغان حجاز ہیں۔ اقبالؔ کی نظم ''فنون لطیفہ'' کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ:۔ اقبالؔ کی تمام شاعری لوگوں کو حرکت و عمل کا پیام دیتی ہے۔ اقبال نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ حرکت زندگی ہے۔ اگر انسان کے اعمال و افعال جذبات و خیالات میں جمود پیدا ہو گیا تو وہ مُردوں کے مانند ہے۔ انسان کا اس دنیا میں قیام آرام کیلئے نہیں بلکہ کچھ کرنے کیلئے ہے چنانچہ اقبالؔ اپنی اس نظم ''فنون لطیفہ'' میں بھی انسانوں سے مخاطب ہیں۔ اور اُن سے کچھ طلب کر رہے ہیں۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا اور اس دنیا میں عمل کرتے ہوئے اپنی دنیا اور آخرت کو سنوارنے کا موقع دیا۔ زندگی انسان کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت ہے۔ انسان کے فائدے کیلئے خدا نے کائنات بنائی۔ جس میں چاند' سورج' ستارے' پہاڑ' ندی' نالے' پھل پھول اور دیگر مخلوقات کو پیدا کیا۔ انسان کا خالق خدا چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق دنیا میں رہ کر اُسے بھول نہ جائے بلکہ کائنات کی چیزوں اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے پس پردہ خدا کی حکمت کو محسوس کرے۔ اور دنیا کے ہنگاموں کو خدا سے منسوب کر لے۔ خدا رازق ہے اور وہ انسان کے بشمول زمین پر موجود چھوٹی اور بڑی اٹھارہ ہزار مخلوقات کو اپنے غیبی خزانے سے بھرپور رزق دے رہا ہے۔ انسان سماجی جانور ہے وہ سماج کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اور سماج میں اپنے کسی فن' ہنر یا پیشہ سے دوسروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے اور اس کے بدلے میں ملنے والی اُجرت سے اپنا پیٹ پالتا ہے اب انسان یہ سوچے کے میں نے اپنی عقل سے اپنے ہنر سے اپنی محنت سے کام کر کے یہ اُجرت کمائی ہے اور اس کے پیچھے کسی کا دخل نہیں ہے تو انسان کی یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اسے ملنے والی زندگی خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے۔ خدا نے انسان کو سوچنے کیلئے عقل دی کام کرنے کیلئے ہاتھ دئے۔ ہنر سکھایا تب انسان کچھ کرنے کے قابل ہو۔ اگر انسان کے پاس خدا کی طرف سے عطا کردہ یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو وہ کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں تھا۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ خدا کی مرضی اور خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ خدا کی یہ عادت ہے کہ وہ کرشماتیطور پر کام نہیں کرتا بلکہ وہ ہر کام کیلئے ایک ذریعہ رکھتا ہے بارش بادلوں سے ہوتی ہے کھیتی زمین سے اُگتی ہے گرمی کا ذریعہ سورج ہے۔ اسی طرح رزق بھی محنت سے ملتا ہے۔ اب خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان اُس کو پہچاننے کیلئے کائنات کی ان چیزوں اور ان انتظامات میں غور کرے۔ اسی لئے اقبالؔ اپنی نظم ''فنون لطیفہ'' کے پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ انسان اپنی عقل' اپنے علم اور اپنے مطالعہ سے عقل مند' عالم' فاضل' دانشور اور مفکر ہو گیا۔ وہ نئی نئی ایجادات کر کے کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانے کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔ انسان اونچی نظر والا ہو گیا ہے اس کی نظر کا ذوق بھی خوب ہے۔ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے دور کی نظر ڈال رہا ہے اور کوشش اور جستجو سے ہر مسئلہ کا حل دریافت کر رہا ہے۔ لیکن اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان شئے میں طاقت اور کرشمہ دیکھ رہا ہے۔ اس کی حقیقت کی طرف نظر نہیں ڈال رہا ہے۔ انسان کسی بیماری کا علاج دریافت کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس نے علاج دریافت کر کے بڑی کامیابی حاصل کی ہے لیکن انسان اس حقیقت سے غافل ہے کہ اچھے انسان کو بیمار بھی خدا کرتا ہے اور خدا ہی انسان کو بیماری کے علاج کی دوا ڈھونڈے کیلئے رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے باوجود دوا میں شفا نہیں ہوتی۔ یہ انسانوں کا مشاہدہ ہے کہ ایک بیماری میں کئی لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سب کو ایک قسم کی دوائی دیتا ہے کچھ لوگ اس دوا سے شفا

یاب ہوتے ہیں اور کچھ لوگوں پر وہ دوا اثر نہیں کرتی۔اس سے معلوم ہوا کہ شفا دوا میں یا ڈاکٹر کے پاس نہیں بلکہ شفا خدا کے حکم میں ہے۔اس لئے عقل مند دانشور انسان کو خدا کی حکمت جان کر سب سے پہلے اپنے مسئلہ کے حل کیلئے اس سے رجوع ہونا چاہئے اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے خدا کی حکمت اور اس کے حکم کو محسوس کرنا چاہئے۔تب انسان کے بہت سے مسائل کا حل ممکن ہے۔

نظم کے دوسرے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان ہنر سیکھتا ہے اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کیلئے ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے کہ اس کی زندگی چین وسکون سے گذر جائے۔لیکن مشاہدہ ہے کہ دنیا کے تمام علوم وفنون انسان کو حقیقی چین و راحت نہیں دے سکتے کیونکہ انسان کو اس زندگی میں قرار نہیں ہے۔انسان کا فن اور ہنر اس کی زندگی میں کام آ سکتا ہے مرنے کے بعد قبر کی زندگی، حشر کا میدان اور آخرت کی ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں دنیا کے یہ فنون کام نہیں آتے۔خدا رزاق ہے اس خیال کو دل میں رکھتے ہئے انسان کو اتنی کوشش کر لینا چاہئے کہ اس کی دنیاوی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔اس کے ساتھ انسان کو ایسا علم سیکھنا چاہئے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی دنیا وآخرت کو کامیاب نا سکے۔اس کیلئے انسان کو ہمیشہ اطاعت الہیٰ کے تحت زندگی گذارنا ہوگا۔

اقبالؔ شعر کے دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کہ چنگاری کی چمک مختصر اور عارضی ہوتی ہے۔چنگاری آگ نہیں ہوسکتی اس طرح چنگاری کی مثال کے طور پر انسان نماز، روزہ، زکوۃ، حج جیسی عبادتوں کے تحت کچھ نیک اعمال کر کے یہ نہ سوچے کہ یہ عبادتیں اس کی دنیا وآخرت کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہوں گی۔بلکہ انسان کو مکمل آگ بننے کیلئے اپنے آپ کو خدا کیلئے وقف کر دینا ہوگا۔اور زندگی کا ہر عمل حکم خداوندی اور طریقہ رسول اللہ ﷺ کے مطابق کرنا ہوگا۔

نظم کے تیسرے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کا دل مثل دریا ہے۔دریا میں طوفان آنے اور موجوں کے اٹھنے کیلئے بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔چھوٹا سا صدف موتی دریا میں ہلچل پیدا نہیں کر سکتا۔اسی طرح انسان کے دل میں نیکی کے چھوٹے موٹے جذبات ہوتے ہیں اور یہ جذبات انسانوں کو عبادت کی طرف راغب کر سکتے ہیں لیکن انسان میں انقلابی تبدیلی آئے اور وہ خود اور اپنے گھر، سماج اور دنیا میں بڑی تبدیلی لائے اس کیلئے دل میں جذبات کو طوفان اٹھنا ضروری ہے۔تب ہی انسان حرکت وعمل کے ذریعہ اپنی ذات میں اور اپنے سماج میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔نظم کے اگلے شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ گیت شاعر بھی گاتا ہے۔اور نغمہ بلبل بھی سناتی ہے دونوں کے نغمے اچھے لگتے ہیں۔اسی طرح باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بھی سائیں سائیں کرتی ترنم پیدا کرتی ہیں لیکن ہوا کبھی شدت اختیار کرتے ہوئے چمن کو اجاڑ دیتی ہے اور نقصان پیدا کرتی ہے۔اسی طرح اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان کو ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جس سے اُسے غم اور پریشانی ہو۔

نظم کے آخری شعر میں اقبالؔ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو ایسا ہنر سیکھنا چاہئے جس میں اُسے مہارت حاصل ہو۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عصاء سے معجزات ظاہر کرتے تھے۔پتھر پر مارتے تو پانی کے چشمے جاری ہو جاتے۔پانی پر مارتے تو راستے بن جاتے اسی طرح اقبالؔ انسان سے اپنے ہنر کی مہارت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ انسان بھی اپنے ہاتھ سے اور اپنے ہنر اور فن سے معجزے دکھائے۔آج مغربی ممالک کے لوگ حرکت وعمل کے ذریعہ بڑی بڑی عمارتیں، پراجکٹس بنا رہے ہیں۔خلاء میں سفر کر رہے ہیں اور ایسے کام کر رہے ہیں جس سے عقل حیران رہ جائے۔اسی لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ بغیر حرکت وعمل کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔اور کوئی قوم جب ترقی کرتی ہے تو اس کے فن اور ہنر سے معجزے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

مرکزی خیال:۔اقبالؔ نظم ''فنون لطیفہ'' سے لوگوں کو حرکت وعمل کا پیام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مرضی سے ہو رہا

ہے۔انسان کو کائنات کی چیزوں میں غور کرتے ہوئے خدا کی قدرت کو پہچاننا چاہئے اور وہ جو کچھ کام کرے اُس کے پیچھے اپنی صلاحیت نہ سمجھے بلکہ خدا کی مرضی جانے۔انسان ایسا کام کرے جس سے اُس کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔دنیا میں وہی قوم ترقی کرتی ہے جو اپنے کام سے انقلابی تبدیلی لاسکتی ہے۔اقبالؔ کی یہ نظم انسان کو دائمی ہنر سیکھنے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

مختصر سوال و جواب

سوال: اقبالؔ کے حالات زندگی بیان کیجئے۔

جواب: **اقبال کا تعارف:۔شیخ محمد اقبالؔ** (1873-1938) اردو کے عظیم مفکر شاعر گذرے ہیں۔سید میر حسن سے عربی اور فارسی پڑھی۔ لاہور کالج سے بی اے اور فلسفہ میں ایم اے کیا۔اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔میونخ یونیورسٹی جرمنی سے فلسفہ عجم کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی اور وطن واپس آکر وکالت اور تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔اقبال کی قومی' فلسفیانہ اور اصلاحی شاعری مشہور ہوئی۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی اور وطنی جذبہ کو ابھارا۔خودی عشق اور حرکت و عمل کے فلسفے کو انہوں نے فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔اقبالؔ مرد مومن میں ان صفات کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے شاعری کے ساتھ پیغمبری کی۔اقبالؔ کے شعری مجموعے بانگ درا' بال جبرئیل' ضرب کلیم اور ارمغان حجاز ہیں۔اقبال کا انتقال 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں ہوا۔

سوال: نظم ''فنون لطیفہ'' کا مرکزی خیال کیا ہے۔

جواب: اقبالؔ نظم ''فنون لطیفہ'' سے لوگوں کو حرکت و عمل کا پیام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ انسان کو کائنات کی چیزوں میں غور کرتے ہوئے خدا کی قدرت کو پہچاننا چاہئے اور وہ جو کچھ کام کرے اُس کے پیچھے اپنی صلاحیت نہ سمجھے بلکہ خدا کی مرضی جانے۔انسان ایسا کام کرے جس سے اُس کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔دنیا میں وہی قوم ترقی کرتی ہے جو اپنے کام سے انقلابی تبدیلی لاسکتی ہے۔اقبالؔ کی یہ نظم انسان کو دائمی ہنر سیکھنے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

نظم: پریت کا گیت از: حفیظؔ جالندھری

سوال: گیت کی تعریف کیجئے۔

جواب: گیت:۔ گیت ایک غنائی نظم ہے۔جو چند بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔گیت کے ہر بند کے مصرعے ایک ہی وزن پر ہوتے ہیں۔اور باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ہر بند کے قافیوں کی ترتیب مختلف ہوسکتی ہے۔گیت کا وہ مصرعہ جو ہر بند میں دہرایا جائے اُسے ٹیپ کا مصرعہ یا انترا کہتے ہیں یہ مصرعہ بند کے مصرعوں کے مساوی ہوسکتا ہے یا چھوٹا بڑا۔گیت گانے کیلئے لکھے جاتے ہیں اسی لئے طویل نہیں ہوتے ہیں ایک سُر اور ایک لے میں ہوتے ہیں۔گیت میں ہندی لفظوں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے زیادہ تر گیت عشقیہ ہوتے ہیں گیتوں میں غم کے جذبات بھی پیش ہوتے ہیں اردو میں حفیظ جالندھری' شکیل بدایونی' مجروح سلطان پوری' ساحر لدھیانوی وغیرہ مشہور گیت کار ہیں۔اردو میں فلموں کیلئے بھی گیت لکھے گئے ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔

سوال: حفیظ جالندھری کی نظم پریت کا گیت کا خلاصہ لکھئے۔

جواب: حفیظؔ جالندھری کا تعارف:۔حفیظؔ جالندھری (1900-1982) اردو کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔انہوں نے اپنی مثنوی شاہ نامہ

اسلام کے ذریعہ شہرت پائی۔ حفیظؔ جالندھری نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی نظموں میں ترنم پایا جاتا ہے انہوں نے گیت بھی لکھے ان کے گیتوں میں روانی اور ترنم پایا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح' شہہ سوار کربلا اور ''پریت کا گیت'' حفیظ کے مشہور گیت ہیں۔ پریت کا گیت کا خلاصہ اس طرح ہے۔

خلاصہ:۔ حفیظؔ جالندھری نے ''پریت کا گیت'' میں ہندوستانیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ آپس میں مل جل کر رہیں۔ محبت کے نغمے اُسی وقت گائے جاتے ہیں جب لوگوں میں نفرت نہ ہو۔ ہندوستان میں کئی مذاہب کئی کئی زبانیں بولنے والے اور کئی تہذیبوں کے لوگ مل کر رہتے آئے ہیں آزادی کے بعد یہاں نفرت کی ہوا پھیلائی گئی۔ ایسے موقع پر شاعروں نے قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے کیلئے گیت لکھے پریت کا گیت بھی ایسی ہی ایک نظم ہے۔

حفیظؔ جالندھری اپنے گیت کے پہلے بند میں لوگوں کو محبت اور بھائی چارے کا سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے انسانو! اپنے دلوں میں محبت کے جذبے کو بسا لیجئے۔ انسان کا دل ایک مقدس عبادت گاہ کی طرح ہے انسان جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں میل آ جاتا ہے اور ویرانی چھا جاتی ہے اپنے دل کو محبت کی روشنی سے آباد کرنا چاہئے آپس میں مل جل کر رہنا ہندوستانیوں کی پرانی روایت ہے جب بھی دلوں میں پھوٹ اور نفاق پیدا ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں کے لوگ مل کر رہنے کی اپنی روایت کو بھول گئے ہیں۔ اسی لئے شاعر اُسے دوبارہ یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ مل جل کر رہنا ہماری قدیم اور مضبوط روایت ہے۔ اسی لئے ہمیں دشمنی مٹاتے ہوئے اپنے دلوں میں محبت و بھائی چارے کے جذبہ کو پروان چڑھانا ہوگا۔

گیت کے دوسرے بند میں حفیظؔ کہتے ہیں کہ جب دلوں میں محبت آتی ہے تو حسد اور جلن دور ہو جاتی ہے دلوں میں حسد اور جلن لانے سے زندگی میں اندھیرا چھا جاتا ہے جو لوگ قوم کی رہنمائی کے منصب پر فائز تھے۔ وہی چور اور لٹیرے ہو گئے۔ شیخ مسلمانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے اور برہمن ہندوؤں کو سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھیں سمجھے جاتے ہیں لیکن آپسی دشمنی سے ہندوستان کی خوبصورتی متاثر ہو گئی۔ دنیا والے دکھاوے کی زندگی گذار رہے ہیں۔ آج ضرورت پڑنے پر کوئی کسی کی مدد کیلئے تیار نہیں ہے ایسے برے وقت میں شاعر انسانوں کو محبت کا سبق پڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت کا جذبہ اتحاد پیدا کرے گا۔ جس سے زندگی میں چین و سکون آئے گا۔

حفیظؔ جالندھری گیت کے تیسرے بند میں کہتے ہیں کہ ہندوستان میں رہنے والے مرد اور عورت سب دکھ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور لوگوں کے دکھوں کو دور کرنے اور زندگی میں خوشی لانے کیلئے ہندوستان والوں کو بھی آگے بڑھنا ہوگا۔ اس لئے شاعر لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ ہمیں غفلت کی نیند سے جاگنا ہوگا۔ لوگوں میں محبت کے پیغام کو عام کرنا ہوگا۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے دلوں میں محبت کا جذبہ پروان چڑھانا ہے جس سے ہمارے دکھ درد دور ہوں گے۔

حفیظؔ آگے کہتے ہیں کہ انسان کسی سے نفرت کرتا ہے نفرت سے دوری پیدا ہوتی ہے اس لئے ہمیں نفرت کو بھلا کر محبت کو عام کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہم محبت کو عام کرنے والوں کے طور پر مشہور ہیں۔ اگر انسان کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے تو انسان کی شکست ہے اس لئے شاعر ہمیں اپنے دلوں سے نفرت کو نکالنے اور اس کی جگہ محبت کو پروان چڑھانے کا مشورہ دیتا ہے۔

گیت کے آخری بند میں حفیظؔ زور دے کر کہتے ہیں کہ محبت اور بھائی چارے سے رہنا ہماری پرانی رسم ہے ہم جان دے کر بھی محبت کو

قربان ہونے نہ دیں۔ جولوگ محبت سے رہتے ہیں وہ کامیاب ہیں اس کامیابی کوسنبھال کر رکھنا ہوگا۔ کیونکہ کچھ لوگ محبت سے رہنے والوں کو نظر لگاتے ہیں اور ان کے دلوں میں نفرت کا بیج بوکر آپسی تفرقہ پیدا کرتے ہیں اس سے پہلے کے لوگ نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں ہمیں اپنی آپسی محبت مضبوط کرنا ہوگا۔ اور اپنے دلوں میں محبت کے جذبہ کو مضبوط قائم کرنا ہوگا۔

مرکزی خیال:۔ حفیظؔ جالندھری اپنی نظم پریت کا گیت میں ہندوستانیوں سے خطاب کرتے ہوئے ان کے دلوں میں محبت کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ گیت ایسے وقت لکھا گیا جب کہ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کچھ فرقہ پرستوں نے نفرت پیدا کر کے آپسی دراڑ اور پھوٹ ڈالی تھی۔ قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے میں شاعر کا یہ گیت اہم رول ادا کرتا ہے اور جب کبھی ہندوستان میں قومی یکجہتی خطرے میں پڑی اس وقت اس طرح کے گیت لوگوں کے دلوں میں محبت کے جذبے کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کرتے رہے ہیں۔

نثر: حکایات مظہر علی خان ولاؔ

تعارف مضمون نگار:۔ مظہر علی خان کا نام مرزا لطف علی تھا۔ لیکن مظہر علی خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ کلکتہ میں قائم کردہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ اور وہاں کئی کتابیں ترجمہ کئے۔ ان کی ترجمہ کردہ کتابوں میں 'ہفت گلشن' 'بیتال پچیسی' تاریخ شیر شاہی اور جہانگیر نامہ ہیں۔ مظہر علی خان نے کئی حکایتیں بیان کی۔ نصاب میں شامل حکایتیں ان کی کتاب ہفت گلشن سے لی گئی ہیں جن کا خلاصہ اس طرح ہے۔

حکایت کی تعریف:۔ حکایت ہماری تہذیب کا کوئی قصہ یا واقعہ ہوتا ہے۔ قصہ سنانے کا مقصد اس قصے سے سبق دینا ہوتا ہے۔ حکایتوں میں قصہ اہم نہیں رہتا بلکہ اس کا سبق اہم رہتا ہے۔ حکایتوں میں جانداروں اور بے جان چیزوں کو گفتگو کرتے دکھایا جاتا ہے اسے تمثیل نگاری کہتے ہیں۔

حکایت۔ شکم اور اعضائے بدن کا مباحثہ:۔ مظہر علی خان ولاؔ نے شکم اور اعضائے بدن کا مباحثہ حکایت میں شکم اور بدن کے دیگر اعضاء کے درمیان ایک مرتبہ ہونے والے جھگڑے کو بیان کیا۔ ایک مرتبہ جسم کے سب اعضاء نے سونچا کہ ہم کوشش کرتے ہیں تو پیٹ میں غذا جاتی ہے۔ ہماری کوشش سے پیٹ کو طرح طرح کے مزیدار کھانے ملتے ہیں لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ اب ہم ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے پیٹ میں غذا جاسکے۔ یہ سونچ کر ہاتھ' منھ اور دانتوں نے پیٹ میں غذا پہنچانے کا عمل روک دیا۔ پیٹ بھوکا رہ گیا لیکن اس نے صبر کیا یہ سلسلہ دو تین دن تک چلتا رہا۔ لیکن پیٹ میں غذا نہ ہونے کے سبب جسم میں کمزوری ہوگئی۔ اور اعضاء سست ہوگئے۔ چمڑے پر خشکی کے آثار دکھائی دیئے۔

حکایت کا فائدہ:۔ اس حکایت سے مظہر علی خان یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ملازمین کو اپنے مالک اور ادارے سے بے وفائی نہیں کرنی چاہئے۔ مالک سے بے وفائی کرنے سے ان کا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مل کر کام کرنا چاہئے۔ اسی میں ان کا فائدہ ہے۔

حکایت۔ خر اور دہقان:۔ مظہر علی خان ولاؔ اس حکایت میں ایک گدھے اور ایک دیہاتی کا قصہ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ ایک گدھے نے شیر کی کھال پہن لی۔ اور اپنا نام شیر رکھ لیا۔ جانور اس سے ڈرنے لگے ایک مرتبہ جب گدھا جنگل سے گذر رہا تھا تب اس کا سامنا اے کدیہاتی کسان سے ہوا۔ گدھے نے شیر بن کر اسے ڈرانے کی کوشش کی لیکن دیہاتی نے گدھے کے کانوں سے اسے پہچان لیا اور اس نے

لکڑی لے کر زور سے گدھے کے سر پر مارا۔ گدھا بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

حکایت کا فائدہ:۔ اس قصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا جس کو جس حال میں بنایا۔ اسی حال میں رہنا چاہئے کوئی شیر کی کھال پہن کر شیر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اس سے کوئی نہیں ڈرے گا۔ الٹا نقصان اٹھانے کا اندیشہ ہوگا۔

حکایت۔ دو یار:۔ مظہر علی خان ولاؔ نے اس حکایت میں دو دوستوں کا قبضہ بیان کیا جو کسی کام شہر سے باہر گئے تھے۔ اچانک جنگل میں ایک ریچھ برآمد ہوا۔ ایک دوست ریچھ کے ڈر سے فوری درخت پر چڑھ گیا۔ دوسرا چڑھ نہ سکا دم سادھ کر زمین پر لیٹ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ مرے ہوئے کو ریچھ نہیں کھاتا۔ ریچھ اس کے قریب آیا اور اسے سونگھ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دوست درخت سے اترا اور سوال کیا کہ ریچھ نے اُس کے کان میں کیا کہا؟ زمین پر لیٹے ہوئے دوست نے جواب دیا کہ ریچھ نے مجھ سے کہا کہ بے وفا یار سے دوستی نہ کر۔

حکایت کا فائدہ:۔ اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ وقت پر کام نہ آنے والوں سے دوستی نہیں کرنی چاہئے۔ اور اچھا دوست وہی ہے جو برے وقت میں اپنے دوست کے کام آئے۔

حکایت۔ لقمان حکیم اور اس کا ایک دوست:۔ لقمان بڑے حکیم گذرے ہیں۔ ان کی حکمت کی باتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے ان کے ایک دوست نے دیکھ کر تعجب سے پوچھا کہ اے لقمان تم بڑے حکیم ہو۔ تمہاری عقل اور فراست کی باتیں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ تم ان بچوں کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو۔ اور اپنی عقل کو کیوں گنوا رہے ہو۔ یہ سن کر لقمان نے کچھ جواب نہیں دیا اور اپنے پاس موجود ایک کمان کو تار سے علیحدہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے تیڑھی کمان سیدھی ہوگئی۔ یہ ماجرا دیکھ کر دوست نے اس طرح کی حرکت کی وجہ پوچھی تو لقمان نے جواب دیا۔ اگر کمان سے تار مسلسل جڑا رہے تو کمان اکڑ جائے گی۔ سیدھی نہیں ہوگی۔ یہ مثال دیتے ہوئے لقمان نے اپنے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا جواب دیا۔

حکایت کا فائدہ:۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے لقمان نے یہ واضح کیا کہ انسان کو مسلسل کام کے دوران کچھ آرام بھی کرنا چاہئے۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اپنا دل بہلا رہے تھے۔ کام کے بعد آرام اور آرام کے بعد کام یہ انسانی زندگی کا طریقہ ہونا چاہئے۔

حکایت۔ چوہا اور میوہ فروش:۔ مظہر علی خان ولاؔ یہ حکایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک میوہ فروش کی دوکان میں ایک چوہا تھا۔ جو خشک اور تر ہر طرح کے میوے دوکان میں سے کھاتا رہتا تھا۔ دوکان دار اسے نظر انداز کرتا رہا۔ ایک دن چوہا حد سے بڑھ گیا اور اس نے دوکان دار کی اشرفیوں کی تھیلی میں سوراخ کر دیا۔ اور اس کی ساری اشرفیاں چرا کر بل میں رکھ دیا۔ دوکان دار کو شک ہوا اس نے بل کھود کر اشرفیاں نکال لیں اور چوہے کو بلی کے حوالے کر دیا۔

حکایت کا فائدہ:۔ اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ کسی کو زیادہ لالچ نہیں کرنا چاہئے اور جتنا ملے اسی پر قناعت کرنی چاہئے۔

ڈرامہ تلاش از: امتیاز علی تاج، قدسیہ زیدی

تعارف:۔ ڈرامہ انارکلی کے خالق امتیاز علی تاج نے چچا چھکن کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں چچا چھکن کی مختلف حرکتوں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ قدسیہ زیدی نے امتیاز علی تاج کی کتاب ''چچا چھکن'' کو ڈرامائی شکل دی۔ ذیل میں اس ڈرامہ کے ایک حصہ ''تلاش'' کا خلاصہ پیش ہے۔

ڈرامہ کی تعریف:۔ ڈرامہ یونانی لفظ Draw سے بنا ہے۔جس کے معنی حرکت کے ہیں۔ڈرامہ ایسی صنف ہے جس میں کرداروں کے مکالموں اوران کی حرکات وسکنات کومنظر نگاری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔تحریری ڈراموں میں کرداروں کے مکالموں اور منظر نگاری کے ذریعہ تاثر پیش کیا جاتا ہے۔

ڈرامہ ''تلاش'' کے کردار:۔ چچا' چچی' ودو' چھٹن' بنو' اماں جی' بندہ' خانصاحب۔

ڈرامے کا خلاصہ:۔ ڈرامہ تلاش کے مرکزی کردار چچا ہیں۔جو اپنی تیز وتند باتوں اور بھولی بھالی حرکتوں سے توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ایک رات چچا لحاف اوڑھے سو رہے تھے کہ ملازم دستک دیتا ہے۔چچا گھڑی دیکھ کر لاحول پڑھتے ہیں اور غصے میں کہتے ہیں کہ اتنی رات گئے کون جگانے آ گیا۔دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ملازم کھڑا ہے۔ملازم کہتا ہے کہ خانصاحب کے پیٹ میں درد ہے۔اورانہوں نے آپ کی ربڑ کی تھیلی منگائی ہے۔یہ سن کر چچا غصہ میں کہتے ہیں کہ انہوں نے دعوت میں اناپ شناپ کھالیا ہوگا۔کھانا تو کسی اور کا تھا لیکن پیٹ کو خانصاحب کا اپنا تھا۔کیا پیٹ کو توپ سمجھ کر بھرلیا۔ملازم کہتا ہے کہ خانصاب کو رات کو دو بجے سے درد ہے۔یہ سن کر چچا کہتے ہیں کہ اچھا ہوتا وہ کسی خیراتی ہسپتال میں بھرتی ہوجاتے۔کیا انہوں نے میرے گھر کو شفا خانہ سمجھ لیا کہ جب جی چاہا آ گئے۔اور سوتوں کو جگالیا۔غصہ کرتے ہوئے چچا ملازم کو ربڑ کی تھیلی دیتے ہیں اور لحاف اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔کچھ دیر بعد ملازم پھر آواز دیتا ہے۔چچا غصے میں کہتے ہیں کہ کیا اب خانصاحب کے انتقال کی خبر لائے ہو۔ملازم ربڑ کی تھیلی واپس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خانصاحب نے اسے واپس کر دیا ہے۔اور کہا کہ اسے اپنے پاس انڈے دینے رکھ لیجئے۔ہم بوتل سے کام چلالیں گے۔اور کہا کہ کبھی ہم سے پالش کی شیشی منگا کر دیکھئے۔خان صاحب سے یہ کڑک جواب سننے کے بعد چچا کمزور پڑ جاتے ہیں۔اور ملازم سے کہتے ہیں کہ میں نے خانصاحب کیلئے غصے میں جو باتیں کہیں تھیں اُسے اس نے کیوں کہہ دیا۔چچا خانصاحب کو کوستے ہوئے سونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں نیند نہیں آتی۔دن میں بھی چچا غصے میں رہتے ہیں کہ خانصاحب نے انہیں پالش کا طعنہ دیا تھا۔چچا سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ خانصاحب سے پالش کی ڈبی منگاتے ہیں۔اور جب خانصاحب نے ان سے ربڑ کی تھیلی منگائی تھی تو انہوں نے خانصاحب کو برا بھلا کہہ دیا۔ملازم نے خانصاحب سے چچا کی کہی ہوئی باتیں کہہ دیں۔جس کے جواب میں خانصاحب نے چچا سے پالش کی ڈبی پھر منگا کر دیکھنے کا طعنہ دیا۔اس بات کو لے کر چچا کی انا کو ٹھیس پہونچ گئی۔اور وہ گھر میں پالش کی ڈبی نہ رکھنے پر اپنی بیگم کو کوسنے لگے۔خانصاب کی جلی کٹی باتیں چچا کے دل پر گہرا اثر کرتی ہیں۔چنانچہ وہ گھر میں بیوی اور بچوں سے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔پالش کی ڈبی کی طرح اپنی عینک کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔بچے مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ عینک تو آپ کی آنکھ کے سامنے لگی ہے۔اس پر چچا خجالت کا اظہار کرتے ہیں۔گھر کے بچے چھٹن بنّو اور وَدّو وغیرہ چچا کا مذاق اڑاتے ہیں۔اور چاچی سے چچا کے عینک بھول جانے کا واقعہ سنانے کی دھمکی دیتے ہیں۔چچا بچوں کو چپ کرانے کے لئے مٹھائی دیتے ہیں۔چچا سب کو مٹھائی پیش کرنے کے بعد اپنے ملازم کو بلاتے ہیں اور اسے ایک آنہ دیتے ہیں اور کام انجام دینے پر چونی دینے کا وعدہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ نکڑ تک جائے وہاں خان صاحب خط بنا رہے ہوں گے تو چپکے سے ان کی سائیکل پنکچر کر دے کیونکہ انہوں نے مجھے پالش کی شیشی کا طعنہ دیا۔اس طرح چچا خان صاحب سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مرکزی خیال: ڈرامہ میں تلاش میں قدسیہ زیدی نے خانصاحب اور چچا کی نفسیات کو پیش کیا ہے۔دونوں کے درمیان جھگڑے کی وجہ ربڑ کی تھیلی ہوتی ہے۔پہلے زمانے میں عام طور پر لوگ ربڑ کی تھیلی رکھا کرتے تھے اور جب کبھی پیٹ میں یا جسم کے کسی حصہ میں درد ہوتا تو اس

تھیلی میں گرم پانی ڈال کر سینکا کرتے تھے۔رات کے وقت خانصاحب کا ربڑ کی تھیلی منگانا چچا کو ناگوار گذرتا ہے۔اور ملازم کی وجہ سے اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کہی جاتی ہے۔ڈرامہ میں چچا کا غصے سے بے قابو ہوجانا اور خانصاحب کو نیچا دکھانے کی کوشش کرنا اہم پہلو ہیں۔ ڈرامے کا عنوان ''تلاش'' عینک کی تلاش پر مبنی ہے۔لیکن ڈرامہ چچا کی عجیب وغریب حرکتوں سے دلچسپی پیدا کرتا ہے۔

چچا کے کردار کا تنقیدی جائزہ: ڈرامہ ''تلاش'' میں چچا کا کردار مرکزی ہے اور وہ اپنے سخت قسم کے جوابات سے اپنی شخصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔لیکن بعد میں خانصاحب کے منہ توڑ جواب سے پریشان ہوجاتے ہیں۔اور اپنی عینک کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ بچے ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ چچا کی انانیت اور غصہ ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔

سوال: ڈرامے کی تعریف کیجئے اور اردو میں ڈرامہ نگاری کے فروغ کے بارے میں نوٹ لکھو۔

جواب: ڈرامہ کی تعریف :

لفظ ڈرامہ یونانی زبان کے لفظ Draw سے بنا ہے۔جس کے معنی ''کر کے دکھانا'' ہے۔ڈرامے کی ابتداء نقالی سے ہوئی۔انسان کبھی کبھی کسی کی نقل کرتا ہے۔ڈرامے میں کرداروں اور مکالمے کے ذریعہ کوئی کہانی پیش کی جاتی ہے۔ڈرامے کے لیے اسٹیج (Stage) اور منظر بھی ضروری ہے۔ ڈرامہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ ادب کی ایسی صنف ہے جس میں انسانی زندگی کی حقیقت اور صداقت کو اسٹیج (Stage) پر نقل کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے ڈرامے Stage پر ہوا کرتے تھے آج ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سنیما میں ریکارڈ شدہ ڈرامے پیش کیے جارہے ہیں۔ڈرامہ سننا یا دیکھنا انسان کو بہت پسند ہے۔

اردو ڈراما کا ارتقاء :

واجد علی شاہ اردو کے پہلے ڈرامہ نگار اور ان کا ڈرامہ ''رادھا کنہیا کا قصہ'' اردو کا پہلا ڈرامہ سمجھا جاتا ہے۔''رادھا کنہیا'' کا قصہ کئی استادوں کی مدد سے اور کئی لاکھ روپے کے صرفے سے تیار کیا گیا۔کئی مہینے اداکاری کی تعلیم دی گئی۔ یہ ڈرامہ پہلی مرتبہ 1843ء میں شاہی محل میں کھیلا گیا۔اس کی تیاری پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا۔واجد علی شاہ نے اور تین ڈرامے ''غزال اور ماہ رو کا قصہ''، ''میم تن اور ماہ پیکر کا قصہ''، ''ماہ پروین اور مہر پرور کا قصہ'' لکھے اردو کے مشہور شاعر آغا حسن امانت نے اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ اندر سبھا 1852ء میں مکمل کیا یہ ڈرامہ 1853ء میں پہلی مرتبہ اسٹیج کیا گیا اور کافی مقبول ہوا۔اندر سبھا کے طرز پر کئی اور سبھائیں لکھی گئیں لیکن امانت کی اندر سبھا جیسی شہرت کسی کو نہیں ملی۔ 1864ء میں اندر سبھا کو ممبئی میں اسٹیج پر کیا گیا۔اس کی مقبولیت نے اردو ڈراموں کی کامیابی کے امکانات واضح کیے۔جس کے نتیجے میں اردو کے تجارتی تھیٹر کا آغاز ہوا۔''خورشید'' اردو تھیٹر کا پہلا ڈرامہ ہے۔جس کو فریدوں جی مرزبان نے گجراتی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔نسردان جی مہرواں جی آرام نے بھی کامیاب ڈرامے لکھے۔سید ابوالفضل فیاض نے ڈرامہ ''صولت عالم گیری'' 1876ء میں تحریر کیا۔اردو ڈرامے کی تاریخ میں اس ڈرامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس کے بعد ڈرامہ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کی ملکیت بن گیا۔مہدی حسن احسن لکھنوی، رونق بنارسی، ونائک پرشاد طالب بنارسی، بیتاب وغیرہ نے پارسی تھیٹر کے لیے عمدہ ڈرامے لکھے۔آغا حشر کاشمیری کا نام اردو ڈرامے کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گا۔انھوں نے 1901ء سے 1932ء تک 29 ڈرامے لکھے۔اپنے عہد کے دوسرے ڈرامہ نگاروں کی طرح آغا حشر کاشمیری بھی تھیٹر کمپنیوں سے وابستہ رہے۔انھوں نے اپنے فن کو زمانے کی ضرورت کے مطابق ڈھالا۔مرید شک، مار آستین، اسیر حرص، سیتا بن باس، آنکھ کا شیشہ، دل کی پیاس، یہودی کی لڑکی وغیرہ ان کی مشہور ڈرامے ہیں۔ان کے ڈراموں میں نظم اور نثر کا امتزاج ملتا ہے۔آغا حشر کے بعد اسٹیج ڈرامے میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔

امتیاز علی تاج نے ڈرامہ ''انارکلی'' 1922ء میں لکھا جو دس سال بعد کتابی شکل میں شائع ہوا۔اردو ڈراما کی تاریخ میں

''انارکلی'' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تھیٹر کے علاوہ اردو ادب میں ڈرامے کی روایت بھی ملتی ہے محمد حسین آزاد نے ڈرامہ ''اکبر'' اور مرزا ہادی رسوا نے ''مرقع لیلیٰ مجنوں'' لکھا یہ ڈرامے ادبی حیثیت سے معیاری لیکن فنی اعتبار سے کمزور ہیں۔ عبدالحلیم شرر کا ''شہد وفا'' اور ''میوۂ تلخ'' عبدالماجد دریا آبادی کا ڈرامہ ''زود پشیماں''، ظفر علی خان کا ''جنگ روس و جاپان''، برج موہن دتاتریہ کیفی کا ڈراما ''راج دلاری''، پریم چند کے ''کربلا'' اور ''روحانی شادی''، برج نرائن چکبست کا ''کملا''، اشتیاق حسین قریشی کے ''صید زبوں''، ''گنہ کی دیوار'' اور ''نقش آخر''، حکیم احمد شجاع کا ''بھارت کا لال''، ''امراؤ علی کا ''البرٹ بل'' وغیرہ اردو کے ادبی ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں تمام تر توجہ مکالموں پر ہے عمل پر نہیں ہے۔ زبان معیاری اور مزاج شائستہ ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس برسوں میں ڈراما فنی شعور اور اسٹیج کی ضروریات سے آشنا ہوا۔ ڈاکٹر عابد حسین کا ''پردۂ غفلت''، فضل الرحمٰن کا ''حشرات الارض''، محمد مجیب کے ''انجام''، ''خانہ جنگی'' اور ''آزمائش'' اہم ڈرامے ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ ایٹا کے زیر اہتمام خواجہ احمد عباسی نے ''یہ امرت ہے''، ''لال گلاب کی واپسی''، سردار جعفری نے ''یہ کس کا خون ہے''، بلراج ساہنی نے ''جادو کی کرسی'' اور عصمت چغتائی نے ''دھانی بانکپن'' جیسے اہم اسٹیج ڈرامے لکھے۔ اس دور میں نثری ڈرامے کو فروغ ہوا اور ''یکبابی'' ڈرامے کو رواج ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ڈراما کی ترقی میں اہم خدمات انجام دیں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، مرزا ادیب، راجندر سنگھ بیدی، ریوتی سرن شرما، حیات اللہ انصاری، کرتار سنگھ دگل اہم ڈرامہ نگار ہیں۔ پرتھوی راج کپور نے پرتھوی تھیٹر قائم کیا اور ''دیوار''، ''پٹھان'' اور ''پیسہ'' جیسے ڈرامے پیش کیے۔ قدسیہ زیدی نے ہندوستانی تھیٹر قائم کیا اور ''گڑیا گھر'' اور ''شکنتلا'' جیسے ڈرامے پیش کیے۔ حبیب تنویر کا ڈرامہ ''آگرہ بازار'' بھی بہت مقبول ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی ڈرامے لکھے ان کے ڈراموں کے مجموعے ''پیسہ اور پرچھائی'' اور ''میرے اسٹیج ڈرامے'' مقبول ہوئے اردو ڈراما نگاروں میں ابراہیم یوسف بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کے ڈراموں کے تین مجموعے ''سوکھا درخت''، ''طنزیہ ڈرامے'' اور ''دھوئیں کے آنچل'' شائع ہو چکے ہیں۔

موجودہ دور میں نثری ڈراما سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے تھیٹر ہال کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے مختلف اوقات میں ڈرامے نشر کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے نئے نئے ڈراموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کے نئے اور اچھے لکھنے والے نثری ڈراموں کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ ریڈیو ڈراما لکھنے والوں میں عشرت رحمانی، شوکت تھانوی، عابد علی عابد، کنہیا لال کپور، اظہر افسر، رشید قریشی، منجو قمر، اقبال مجید وغیرہ شہرت رکھتے ہیں۔

ضلع نظام آباد کے تاریخی مقامات

ڈاکٹر محمد عبدالقدیر مقدرؔ

محمد عبدالقدیر نام اور تخلص مقدرؔ ضلع نظام آباد میں 7/فبروری 1952ء کو پیدا ہوئے۔ والد مولوی شیخ فرید صاحب ٹریژری میں اکاؤنٹنٹ ملازم تھے۔ آپ ابھی ہفتم میں ہی تھے کہ والد کا 1960ء میں اور اس کے ایک سال بعد والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم آغا خان اسکول نظام آباد میں ہوئی۔ بعد میں شکر نگر میں مقیم اپنے چچا محمد عبدالوحید صاحب کی نگرانی میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کی تکمیل کی۔ شکر نگر میں ادبی ماحول میں رہنے کا موقع ملا۔ اور یہیں سے ادبی ذوق پیدا ہوا۔ افسانہ نگاری اور شاعری کا سلسلہ شروع ہوا۔ میٹرک کے بعد نظام آباد اپنے دادا شیخ داؤد صاحب کے ہاں آ گئے۔ خانگی مدرسے سے پیشہ تدریس کا آغاز کیا۔ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ ادبی مرکز سے وابستہ ہو کر طرحی اور غیر طرحی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ 1976ء میں بہ حیثیت مدرس سرکاری ملازمت میں بھیمگل میں تقرر

عمل میں آیا۔ ملازمت کے ساتھ انہوں نے تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی۔اے، بی او ایل اور ایم اے کیا۔ 1998ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ''راجہ مہدی علی خان کی ادبی خدمات'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کیا۔ ان کے تحقیقی مضامین، انشائیے، افسانے اور کلام ہندو پاک کے مقبول رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ 2009ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ 2010ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اور ان دنوں ایک علمی، ادبی اور دینی رسالہ ''تہمید'' کے مدیر ہیں۔ یہ رسالہ 2010ء سے ماہانہ پابندی سے نکل رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر کی شاعری میں غزل، حمد و نعت، منقبت اور موضوعاتی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ''مقدرات'' (شعری مجموعہ) 1996ء۔ رشتوں کا احساس۔ افسانوی مجموعہ 2000ء۔ حرف ناگفتنی (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2005۔ راجہ مہدی علی خان کی ادبی خدمات (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی) 2006ء۔ خط لکھیں گرچہ مطلب (خطوط کا مجموعہ) 2011ء۔ کلیات راجہ مہدی علی خاں جلد اول (مرتبہ) 2012ء شائع ہوکر دنیا میں مقبول عام ہوئے۔ اس کے علاوہ نغمات راجہ مہدی علی خان جلد دوم اور نثریات راجہ مہدی علی خان بھی زیر طباعت ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر کو 1997ء میں آبروئے سخن ایوارڈ، نریش کمار یادگار کمیٹی نکودر (پنجاب) ادبی ایوارڈ 2000ء۔ اردو اکیڈیمی ایوارڈ اور 2009ء میں راجہ مہدی علی خان کی ادبی خدمات پر اردو اکیڈیمی کی جانب سے ایوارڈ ملے۔

ضلع نظام آباد کے تاریخی مقامات (مضمون)

شہر نظام آباد کو اندور یا اندراپوری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر ریاست آندھرا پردیش کا ایک ضلع میونسپل کارپوریشن ہے جسکی کُل آبادی 10 لاکھ سے زیادہ ہے۔ اور ریاست کے دس گنجان آبادی والے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ضلع کے 36 منڈلس ہیں اور وہ ریاست کے دارالحکومت حیدرآباد سے 171 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں نظام آباد پر سلطنت راشٹرا کتا کے بادشاہ اندراولبھ پنتھیا نے حکومت کی تھی۔ 1905ء میں سکندرآباد اور منماڑ کے درمیان براہ نظام آباد ریلوے لائن بچھائی گئی اور اسٹیشن کا نام نظام سرکار نظام الملک کے نام پر نظام آباد رکھا گیا۔ 1923ء میں دریائے مانجرا پر اچم پیٹ کے مقام پر نظام ساگر ڈیم بنایا گیا جس سے ہزاروں ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے۔ ضلع نظام آباد کے کئی اہم ٹاؤنس اور منڈلس ہیں جیسے بودھن، آرمور، کامارپلی، بانسواڑہ، بھیمگل اور یلاریڈی وغیرہ ہیں۔ بودھن کے علاقے شکر نگر میں ایشیاء کی مشہور نظام شوگر فیاکٹری قائم ہے۔

1915ء میں غلام یزدانی ناظم محکمہ آثار قدیمہ نے بودھن کی دیول نما مسجد سے ایک ستون برآمد کیا۔ جس پر کنڑی اور فارسی تحریر کندہ تھی۔ جسے محکمہ معتمدی امور عامہ سرکار عالی کو ترجمہ کے لئے بھیجا گیا تھا جس سے پتہ چلا کہ راشٹرکوٹ کے ایک راجہ اندر ولبھیا تنیا اندر سوم نے بودھنیا بودھن کو شائد اپنی راجدھانی بنایا تھا اسی لئے گمان غالب ہے کہ نظام آباد کا نام اندور اسی مناسبت سے رکھا گیا۔ 1304ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے سپہ سالار ملک کافور کو راجدھانی ورنگل کی فتوحات کے لئے بھیجا تو یہ اندور کو بھی تاراج کرتا ہوا لوٹا۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق نے ملک فخرالدین کی قیادت میں دکن کی مہم سر کی تو موضع اندور اور قندھار اس کے زیر اثر آ گئے۔ تیرھویں صدی کے وسط تک دکن کا سارا علاقہ بہمنی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اور موضع اندور ضلع بیدر کے تحت آ گیا تھا۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی دور زرین دور کہلاتا ہے۔ علم و

ہنرفنون لطیفہ کا فروغ، بزرگان دین علماء اور فضلا کا جمگھٹا، گویا گولکنڈہ ایک پرکشش علاقہ بن گیا۔ عالیشان عمارتیں، مساجد و مقبرے وغیرہ یہ پرشکوہ یادگاریں آج بھی سیاحتی مراکز بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ضلع نظام آباد کے تاریخی علاقوں میں بھی تاریخی عمارتیں صحیح وسالم ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں مغلوں کے دکن پر حملے سے بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور موضع اندور بھی مغلیہ سلطنت کے زیر اثر آ گیا۔ محمد کاظم کو علاقے کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ اس طرح موضع اندور 1628ء تا 1707ء فوجداری عمل کے تحت رہا۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب جب دکن فتح کرنے کے لئے نکلا تو مرہٹواڑے کی سرحد عبور کرتا ہوا بودھن، موضع اندور، بالکنڈہ اور بھیمگل کے راستے سے گولکنڈہ کا رخ کیا۔ ضلع نظام آباد دراصل شمالی ہند سے دکن یعنی گولکنڈہ تک پہونچنے کے راستے میں واقع ہے۔ اور گولکنڈہ پر حملے کی صورت میں دشمن کی فوجوں کو اسی راستے سے گذرنا پڑتا تھا۔ حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ جب حیدرآباد آئے تو اسی راستے سے ان کا گذر ہوا تھا۔ اور حضرت بابا نتھر شاہ ابدالؒ واقع بابا پور نے بھی کچھ دنوں قیام کیا تھا۔ اورنگ زیب کی آمد دکن کا بھی راستہ یہی تھا۔ اور وہ براہ بودھن نظام آباد گولکنڈہ پہونچا تھا۔ بودھن میں شہنشاہ کی شب بسری کی کہاوت زبان زد خاص وعام ہے۔ کہ اس شب شہنشاہ کی نماز فجر قضا ہوگئی تھی۔ تب شہنشاہ نے اس سرزمین سے متعلق کہا تھا کہ ''بودن جائے بود نیست'' یہاں ایک چھوٹی سی مسجد اس دور کیا یادگار ہے۔ اسی طرح بالکنڈہ اور بھیمگل میں بھی ہے۔ دکن کی فتح کے بعد 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور ہوگئی۔ اور دکن میں 1724ء تا 1947ء آصف جاہی سلطنت قائم ہوئی۔ اور کل سات حکمرانوں نے آصف جاہی سلطنت کو بڑی شان وشوکت کے ساتھ چلایا۔ اور اپنے دور حکومت میں کئی یادگاریں قائم کیں۔ نظام آباد میں بھی کئی تاریخی مقامات اور قلعے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

قلعہ نظام آباد: نظام آباد میں جانب مغرب ایک بلند پہاڑ پر جس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً تین سو فٹ ہے پر ایک پختہ خوبصورت قلعہ واقع ہے سابقہ محققین اور تاریخ دانوں نے اس کی تعمیر اور تعمیر کنندہ سے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تاریخ نظام آباد کے مولف محترم غلام احمد نائطی وکیل اس قلعے کی تعمیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''اس قلعے کی کوئی مستند تاریخ اس وقت تک ہاتھ نہیں آئی ہے چونکہ اس قلعہ کی جانب جنوب ایک وسیع تالاب رگھوناتھ تالاب کے نام سے موسوم ہے اس لئے اکثر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس تالاب اور عمارت کا بانی رگھوناتھ داس تھا۔'' راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق اس تاریخی قلعہ کی تعمیر رگھوناتھ داس نے ہی کی۔ جو آصف جاہ سوم نواب صلابت جنگ بہادر 1750ء کی فوج میں رہنما تھے۔ صلابت جنگ بہادر کی جانشینی آصف جاہی سلطنت کے لئے سودمند ثابت نہ ہوئی اور امراء نے انہیں معزول کر کے نواب میر نظام علی خاں بہادر کو جانشیں بنایا۔ ان کے دور میں ارسطو جاہ نہایت ذہین وزیر تھے۔ 1795ء میں مرہٹوں سے جنگ میں آصف جاہی فوج کو شکست ہوئی تھی۔ اور ارسطو جاہ قید کر لئے گئے تھے۔ بعد میں صلح ہوگئی۔ اور ارسطو جاہ رہا ہوگئے۔ ارسطو جاہ نے رہائی کے بعد سرحدوں کو مستحکم بنانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ نظام آباد میں بھی رگھوناتھ داس کے ذریعے قلعے کی تعمیر کروائی گئی۔ اس سے متصل ایک تالاب بنایا گیا۔ دہری فصیل والا یہ قلعہ دراصل ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے سیاسی قیدیوں کو رکھنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ قلعے کے اندر ایک ہال میں بڑی بڑی چکیاں ہیں جو دراصل قیدیوں کو آٹا پیسنے لگانے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ قلعے کا باب الداخلہ بڑی بڑی چٹانوں سے بنایا گیا ہے۔ سنتری کے لئے ایک چوکی بنی ہوئی ہے۔ باب الداخلہ سے گذرنے کے بعد کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ پر ایک اور فصیل اور دروازہ ہے۔ اندر داخل ہونے کے ہونے کے لئے دشوار گذار راستے سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ قلعہ مرہٹوں اور

انگریزی افواج کی نقل وحرکت سے باخبر رہنے اور مدافعت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعے میں مندر اور مسجد ہے۔ 1915ء میں مسٹر ہن کرن صدر ناظم محکمہ محابس نے جیل تک پہونچنے کے لئے سیڑھیاں بنوائی۔ قلعہ عرصہ دراز تک قیدیوں کے لئے جیل بنا رہا۔ اب جیل کے لئے علٰحیدہ عمارت تعمیر ہوگئی ہے۔ ایک عرصے تک قلعے کے احاطے میں گورنمنٹ گری راج کالج قائم تھا۔ جواب اپنی ذاتی عمارت محلّہ دوبہ میں قائم ہے۔ قلعے سے جانب مشرق ایک طویل سڑک جو محلّہ پھولانگ کو جاتی ہے درمیان میں سنگ بستہ کمانیں بنائی گئی تھیں۔ سڑک کی کشادگی کے لئے ان پختہ کمانوں کو منہدم کردیا گیا۔ ایک کمان گڑھی کی کمان کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

قلعہ کولاس: کولاس موضع ضلع نظام آباد سے جانب جنوب 36 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا پہاڑی سلسلہ بالا گھاٹ سے ملتا ہے۔ یہاں جمشید قطب شاہ کے عہد میں 1494ء میں قلعہ تعمیر ہوا۔ یہ قلعہ نہایت قدیم اور پرشکوہ عمارت کا حامل ہے۔ 1666ء میں یہ قلعہ سید محمد طاہر کے تحت تھا۔ اس کے تحت سالانہ چھ لاکھ پچپن ہزار سات سو روپئے محاصل تھا۔ اس قلعے کے تحت پرگنہ روڈلور، پرگنہ گندھاری، پرگنہ ساتولی، پرگنہ نارائن کھیڑ تھے۔ 1709ء میں یہ قلعہ سلطنت آصفیہ میں شامل ہوگیا۔ اور 1736ء میں نواب بصالت جنگ کے تحت تھا۔ جو اس وقت دیوان مقرر تھے۔ 1756ء میں اس قلعہ کو راجہ پدم سنگھ کو ان کے باپ امی چند کی وفاداری اور خدمات کے صلہ میں عطا کیا گیا۔ عہد نواب میر محبوب علی خان میں یہ قلعہ راجہ درجن سنگھ کی وراثت میں تھا۔ راجہ کے انتقال کے بعد رانی سون کنور بائی اس کی وارث ہوئیں۔ 1913ء میں نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کے سمستھان میں شریک کرلیا گیا۔

قلعہ دومکنڈہ: 1784ء میں دومکنڈہ سمستھان قائم ہوا۔ سرکار کولاس کے تحت پرگنہ درکی تھا۔ راجہ رگھویندر راؤ اور راجہ اماپت راؤ اس کے دعویدار تھے۔ پانچ سال کے لئے انہیں عطا کیا گیا۔ تب درکی اور بانسواڑہ علٰحیدہ علٰحیدہ مواضعات قرار دئے گئے۔ اسے 1863ء کو شریک خالصہ کیا گیا۔ اور 1933ء کو بانسواڑھ تعلقہ قرار دیا گیا۔

قلعہ بالکنڈہ: بالکنڈہ کو دکن کا باب الداخلہ کہا جاتا ہے۔ جونا گپور سڑک پر واقع ہے۔ مسلمانوں نے جب دکن کو اپنا وطن بنایا تو بالکنڈہ ہی گولکنڈہ تک پہونچنے کا راستہ تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے جری اور بہادر مانے جاتے ہیں۔ شیخ نظام منور جو بیجاپور کا متوطن تھا فن سپہ گری کا ماہر تھا عادل شاہ کے دربار تک رسائی حاصل کی خان زماں خاں اور بہادر فتح جنگ کے خطابات سے نوازا گیا اسے بالکنڈہ پرگنہ عطا کیا گیا۔ شیخ کے انتقال کے بعد 1696ء میں مغرب خاں کو جاگیر وتمغہ بالکنڈہ عطا کیا گیا۔ شہزادہ اعظم جاہ کے ساتھ مقابلے میں امین خان کے تمام لڑکے کام آئے چنانچہ شاہ عالم نے امین خاں کو طلب فرما کر ان کی یہ موروثی جاگیر بحال کردی اور 1706ء کو نرمل کے تحت بالکنڈہ بھی عطا کیا گیا۔ قلعہ بالکنڈہ کے کھنڈرات اپنی عظمت وجلال کے مظہر ہیں۔

قلعہ نرمل: موضع نرمل کو دراصل ایک لمبانائر نامی کولی نے آباد کیا تھا جو ایک متمول سپاہی تھا۔ یہ مقام 1317ء کے لگ بھگ آباد ہوا۔ 1716ء میں امین خان کے تصرف میں لایا گیا۔ اور قلعہ کی تعمیر کی۔ 1776ء میں آصف جاہی فوج نے قلعہ فتح کیا۔ اور قلعہ نرمل امام علی خاں برہان الدولہ بہادر کے حوالے کیا گیا۔ بعد میں یہ قلعہ راجہ شنکر راؤ، محمد علی خاں لوہان، مرزا ابراہیم بیگ مبارز الملک ظفر الدولہ کے زیر اثر آ گیا۔ پہلی ضلع بندی کے موقع پر یہ علاقہ خالصہ کر کے ضلع اندور کے تحت کردیا گیا تھا۔ دوسری ضلع بندی کے موقع پر نرمل ضلع عادل آباد کے تحت کردیا گیا۔

آصف جاہی دور کو ضلع نظام آباد کے لئے سنہری دور کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اہل نظام آباد اپنی رعایا پرور حکمران نواب میر محبوب علی خان بہادر اور

نواب میر عثمان علی خان بہادر کی رعایا پروری کو فراموش نہیں کر سکتے۔اس دور میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے لئے ایک جان دو قالب کی طرح رہا کرتے تھے۔اور خود نواب میر عثمان علی خان بہادر ہندو اور مسلمانوں کو اپنی دونوں آنکھوں سے تعبیر کرتے تھے۔نظام آباد کی گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا ثبوت یہ تھا کہ رانی چہلم جانکی بائی سرنا پلی نے بارہ ہزار روپئے کے صرفے سے 1904ء میں کلاک ٹاور کی تعمیر اور اس گنج کو محبوب گنج سے موسوم کیا تھا۔جو بعد میں گاندھی گنج اور کشن گنج کے نام سے جانا گیا۔اسی طرح 1908ء میں پہلا کتب خانہ احمد اللہ خاں صاحب منصور نے قائم کیا۔1934ء میں کتب خانہ عثمانیہ کے نام سے مجلس لوکل فنڈ سے زائد ایک ہزار گز معہ پلاٹ کی منظوری سے سید دلدار حسین ایکزیکیٹیو انجنیئر کے ہاتھوں سنگ بنیاد رکھا گیا۔اس کتاب خانہ کو آج پاپو جی واچنالیہ کہا جاتا ہے۔1970ء میں سرکاری دواخانہ کا قیام عمل میں آیا۔ڈاکٹر قمر الدین صاحب اس کے پہلے سرجن مقرر ہوئے۔ویلسن مشن عیسائی تنظیم نے 1916ء میں جذامیوں کا دواخانہ ڈچپلی میں قائم کیا۔جو ملک بھر میں اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد دواخانہ ہے۔1836ء میں دواخانہ یونانی مسجد عروب سے متصل قدیم عمارت میں آج قائم ہے۔یہاں حکیم برہان الدین صاحب پہلے یونانی حکیم مقرر ہوئے۔آج یہ دواخانہ زبوں حالی اور عدم توجہ کا شکار ہے۔عوام کی تفریح گاہ کے لئے باغ عامہ 1902ء میں محبوب باغ کے نام سے بنایا گیا۔جو آج تلک گارڈن کہلاتا ہے۔اس کے درمیان ٹاؤن ہال ہے جس کا سنگ بنیاد مرزا محمد بیگ صاحب اول تعلقدار کے ہاتھوں 1903ء میں رکھا گیا۔ایک سال میں اس کی تعمیر مکمل ہوگئی۔اس کی تعمیر میں مستاجر آبکاری دین شاہ جی نے فراغ دلانہ عطیہ دیا ۔اور پرنس آف برار نواب مکرم جاہ بہادر کے ہاتھوں 1904ء میں عمل میں آیا۔اور اسی سال شہر نظام آباد کے لئے برقی اسٹیشن (پاور ہاؤز) کا افتتاح بھی پرنس آف برار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔1932ء میں علی ساگر کا سنگ بنیاد سید دلدار حسین اکزیکیٹیو انجینئر کے ہاتھوں رکھا گیا۔یہ تفریح گاہ علی نواز جنگ انجنیئر نظام ساگر کے نام سے موسوم کیا گیا۔نواب مکرم جاہ بہادر شہزادی درشہوار کے ہمراہ رونق افروز ہوئے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

شہر نظام آباد کی موجودہ تہذیب وتمدن اور معاشرت کے نظام کو جو برسہا برس کے تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے سمجھنے کے لئے اسلاف کی لکھی تاریخ کا مطالعہ جو حقائق وصداقت پر مبنی ہے سمجھنے اور آگے ترقی کی راہوں کو متعین کرنے میں معاون ہوگی۔

مختصر سوال جواب

سوال: غزل کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں۔

جواب: غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں۔لیکن شاعری کی اصطلاح میں غزل ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں جدا جدا اشعار میں زندگی کے مختلف تجربات بیان کئے جاتے ہیں۔

سوال: غزل کے پہلے شعر کو کیا کہتے ہیں۔(یا) مطلع کسے کہتے ہیں۔

جواب: غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔لفظ مطلع طلوع سے بنا ہے۔جس کے معنی شروع ہونا یا نکلنا کے ہیں۔جس شعر سے غزل کا آغاز ہوتا ہے اسے مطلع کہتے ہیں۔مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہم ردیف ہوتے ہیں۔نصابی کتاب مطالعہ ادب میں شامل غالب کی غزل کا مطلع اس طرح ہے۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

سوال: غزل کے اشعار کی تعداد کتنی ہوتی ہے۔

جواب: غزل میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ اکیس شعر ہوتے ہیں۔غزل میں قافیوں کی قید کی وجہ سے زیادہ اشعار پیش نہیں ہوتے۔

سوال: غزل کے اچھے شعر کو کیا کہتے ہیں۔

جواب: غزل کے اچھے شعر کو شاہ بیت یا حاصل غزل شعر کہتے ہیں۔

سوال: غزل کے آخری شعر کو کیا کہتے ہیں۔

جواب: غزل کے آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں۔لفظ مقطع قطع سے بنا ہے جس کے معنی روکنا یا ختم کرنا ہے۔شاعر جس شعر کے ذریعے غزل کا اختتام کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔مقطع میں اکثر شاعر اپنا تخلص بھی استعمال کرتا ہے۔

سوال: تخلص کسے کہتے ہیں۔

جواب: وہ مختصر نام جو شاعر اپنے کلام میں مقطع میں استعمال کرتا ہے اسے تخلص کہتے ہیں۔تخلص کے لئے (~) نشانی استعمال کی جاتی ہے۔اردو شعرا کے چند تخلص اس طرح ہیں۔میرؔ۔آتشؔ۔غالبؔ۔انیسؔ وغیرہ۔

سوال: اردو غزل کے موضوعات کیا ہیں۔

جواب: اردو غزل کے موضوعات میں عشق، تصوف، فلسفہ، غم دوراں، غم جاناں اور زندگی کے مسائل اور مشاہدات شامل ہیں۔دور حاضر کے غزل میں سیاست اور زندگی کے مسائل کی عکاسی کی طرف توجہ دی جارہی ہے۔

سوال: اردو کے اہم غزل گو شعرا کے نام لکھئے۔

جواب: اردو کے اہم غزل گو شعرا میں امیر خسرو۔قلی قطب شاہ۔ولیؔ۔میرؔ۔آتشؔ۔ناسخؔ۔غالبؔ۔مومنؔ۔دردؔ۔فراقؔ۔ناصر کاظمی وغیرہ ہیں۔

سوال: نصابی کتاب ''مطالعہ ادب'' حصہ اول میں کن شعراء کی غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

جواب: نصابی کتاب ''مطالعہ ادب'' حصہ اول میں محمد قلی قطب شاہ۔ولیؔ۔سراجؔ۔میرؔ۔آتشؔ۔غالبؔ۔حالیؔ اور مخدوم کی غزلیں شامل ہیں۔

سوال: ولیؔ کا مختصر تعارف بیان کیجئے۔

جواب: ولی محمد ولیؔ اورنگ آبادی 1648ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔صوفیانہ ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔انہوں نے دکنی اور فارسی کے بجائے اردو میں شاعری شروع کی۔ولیؔ کو سیر و سیاحت کا شوق تھا۔اپنے استاد سعد اللہ گلشن کی ہدایت پر شمالی ہند کا سفر کیا۔وہاں ان کا اردو کلام سن کر دہلی کے شعرا نے بھی فارسی کے بجائے اردو میں شاعری شروع کی۔انہوں نے تصوف اور عشق حقیقی و عشق مجازی کے موضوعات پر شاعری کی۔ولی کا انتقال 1707ء میں ہوا۔

سوال: ولیؔ کے استاد کا نام کیا تھا۔

جواب: ولیؔ کے استاد کا نام سعد اللہ گلشن تھا۔

سوال: ولیؔ کی غزل کا مطلع لکھئے۔

جواب: ولیؔ کی غزل کا مطلع اس طرح ہے۔

پی کے ہوتے نہ کر تو مہ کی ثنا معتبر نئیں ہے حسن دور نما

سوال: ولیؔ کی غزل کا مقطع لکھئے۔

جواب: اے ولی مجھ سخن کوں وہ بوجھے جس کوں حق نے دیا ہے فکر رسا

سوال: سراج اورنگ آبادی کا مختصر تعارف بیان کیجئے۔

جواب: سراج اورنگ آبادی 1715ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں شاعری کی پانچ چھ سال کی عمر میں اپنا دیوان مکمل کر لیا۔ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ شاہ عبدالرحمن سے بیعت ہوئے اور ان کے مشورے پر شاعری ترک کر دی۔ سراج کو صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ عشق حقیقی میں ڈوب کر انہوں نے روحانی کیفیات کے ساتھ شاعری کی۔ ان کے کلام سادگی اور سوز پایا جاتا ہے۔

سوال: سراج کی غزل کا مطلع لکھئے۔

جواب: سراج کی غزل کا مطلع اس طرح ہے۔

مجکوں یکدم قرار نئیں ہرگز تجھ بن اختیار نئیں ہرگز

سوال: سراج کی غزل کا مقطع لکھئے۔

جواب: سراج کی غزل کا مقطع اس طرح ہے۔

ہجر کی رات میں مثال سراج اشک غم کا شمار نیں ہرگز

سوال: میر تقی میر کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: میر تقی میر (1722-1810) اردو غزل کے نامور شاعر گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنی جذباتی اور داخلی شاعری کے ذریعے اردو غزل کا دامن وسیع کیا۔ انہیں ''خدائے سخن'' کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، صفائی، نشتریت، ندرت اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ میر کی شاعری کے چھ دیوان مشہور ہیں۔ میر نے دہلی کی تباہی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور انہیں اپنی شاعری میں پیش کیا۔ میر کی تصانیف میں کلیات کے علاوہ تذکرہ نکات الشعرا اور سوانح ذکر میر اہم ہیں۔ میر کا لکھنو میں انتقال ہوا۔

سوال: میر کی غزل کا مطلع لکھئے۔

جواب: میر کی غزل کا مطلع اس طرح ہے۔

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں اس غم کدہ میں آہ دل خوش کہیں نہیں

سوال: میر کی غزل کا مقطع لکھئے۔

جواب: میر کی غزل کا مقطع اس طرح ہے۔

فکر بلند سے میں کیا آسماں اسے ہر ایک سے میر خوب ہو وہ یہ زمیں نہیں

سوال: آتش کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: خواجہ حیدر علی آتش لکھنو کے ایک مشہور غزل گو شاعر گذرے ہیں۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری میں عام خیالات، تصنع، رعایت لفظی ملتی ہے۔ رنگینی اور شوخی ان کے کلام کی اہم خوبی ہے۔ بعد میں استاد شاعر بنے۔ ان کے کئی شاگرد مشہور ہوئے۔

سوال: آتش کی غزل کا مطلع اور مقطع لکھئے۔

جواب: آتش کی غزل کا مطلع

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

آتش کی غزل کا مقطع

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے　　آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

سوال:　حکایت کسے کہتے ہیں۔

جواب: حکایت کی تعریف:۔ حکایت ہماری تہذیب کا کوئی قصہ یا واقعہ ہوتا ہے۔ قصہ سنانے کا مقصد اس قصے سے سبق دینا ہوتا ہے۔ حکایتوں میں قصہ اہم نہیں رہتا بلکہ اس کا سبق اہم رہتا ہے۔ حکایتوں میں جانداروں اور بے جان چیزوں کو گفتگو کرتے دکھایا جاتا ہے اسے تمثیل نگاری کہتے ہیں۔

سوال: مظہر علی خان ولا کا تعارف لکھئے۔

جواب: مظہر علی خان کا نام مرزا لطف علی تھا۔ لیکن مظہر علی خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ کلکتہ میں قائم کردہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ اور وہاں کئی کتابیں ترجمہ کئے۔ ان کی ترجمہ کردہ کتابوں میں 'ہفت گلشن' بیتال پچیسی' تاریخ شیر شاہی اور جہانگیر نامہ ہیں۔ مظہر علی خان نے کئی حکایتیں بیان کی۔ نصاب میں شامل حکایتیں ان کی کتاب ہفت گلشن سے لی گئی ہیں۔

سوال: ڈرامہ کی تعریف بیان کرو۔ اور اس کے اجزا کیا ہیں لکھو۔

جواب: تعارف:۔ ڈرامہ انارکلی کے خالق امتیاز علی تاج نے چچا چھکن کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں چچا چھکن کی مختلف حرکتوں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ قدسیہ زیدی نے امتیاز علی تاج کی کتاب ''چچا چھکن'' کو ڈرامائی شکل دی۔ ذیل میں اس ڈرامہ کے ایک حصہ ''تلاش'' کا خلاصہ پیش ہے۔

ڈرامہ کی تعریف:۔ ڈرامہ یونانی لفظ Draw سے بنا ہے۔ جس کے معنی حرکت کے ہیں۔ ڈرامہ ایسی صنف ہے جس میں کرداروں کے مکالموں اور ان کی حرکات وسکنات کو منظر نگاری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔ تحریری ڈراموں میں کرداروں کے مکالموں اور منظر نگاری کے ذریعہ تاثر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرامے کے اجزا میں کہانی۔ مکالمے۔ کردار۔ اسٹیج۔ زماں ومکاں۔ منظر نگاری وغیرہ اہم ہیں۔

سوال: ڈرامہ تلاش کس نے لکھا اس ڈرامے کے کردار کیا ہیں۔

جواب: ڈرامہ ''تلاش'' قدسیہ زیدی نے ترتیب دیا۔ یہ دراصل مشہور ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کی کتاب ''چچا چھکن'' کے چار روپوں میں سے ایک ہے۔ اس ڈرامے کے کردار چچا' چچی' ودو' چھٹن' بنو' اماں جی' بندہ' خانصاحب ہیں۔

سوال: قدسیہ زیدی کا تعارف پیش کیجئے۔

جواب: قدسیہ زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر بشیر حسین زیدی کی بیوی تھیں۔ دہلی میں زندگی گذاری۔ بچوں کے لئے کتابیں لکھیں۔ اور ڈرامے بھی لکھے۔ دہلی میں ڈرامہ تھیٹر کی بنیاد رکھی۔ اور کئی ڈرامے پیش کئے۔ انہوں نے سنسکرت کے مشہور ڈرامہ شکنتلا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور امتیاز علی تاج کی مشہور کتاب ''چچا چھکن'' سے ایک حصہ ''تلاش'' کے عنوان سے پیش کیا۔

سوال: عبدالقدیر مقدر کا تعارف پیش کیجئے۔

جواب: محمد عبدالقدیر نام اور تخلص مقدرؔ ضلع نظام آباد میں 7/فبروری 1952ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آغا خان اسکول نظام آباد میں ہوئی۔ بعد میں شکر نگر میں مقیم اپنے چچا محمد عبدالوحید صاحب کی نگرانی میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کی تکمیل کی۔ شکر نگر میں ادبی ماحول میں رہنے کا موقع ملا۔ اور یہیں سے ادبی ذوق پیدا ہوا۔ افسانہ نگاری اور شاعری کا سلسلہ شروع ہوا ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ ادبی مرکز سے وابستہ ہو کر طرحی اور غیر طرحی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ 1976ء میں بہ حیثیت مدرس سرکاری ملازمت میں بھیمگل میں تقرر عمل میں آیا۔ ملازمت کے ساتھ انہوں نے تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی۔ اے، بی او ایل اور ایم اے کیا۔ 1998ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ''راجہ مہدی علی خان کی ادبی خدمات'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کیا۔ ان کے تحقیقی مضامین، انشائیے، افسانے اور کلام ہندو پاک کے مقبول رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ 2009ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ 2010ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اور ان دنوں ایک علمی، ادبی اور دینی رسالہ ''تہمید'' کے مدیر ہیں۔ یہ رسالہ 2010ء سے ماہانہ پابندی سے نکل رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر کی شاعری میں غزل، حمد و نعت، منقبت اور موضوعاتی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ '' مقدرات'' (شعری مجموعہ) 1996ء۔ رشتوں کا احساس۔ افسانوی مجموعہ 2000ء۔ حرف ناگفتنی (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2005۔ راجہ مہدی علی خان کی ادبی خدمات (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی) 2006ء۔ خط لکھیں گرچہ مطلب (خطوط کا مجموعہ) 2011ء۔ کلیات راجہ مہدی علی خاں جلد اول (مرتبہ) 2012ء شائع ہو کر دنیا میں مقبول عام ہوئے۔

سوال: قلعہ نظام آباد کے بارے میں نوٹ لکھو۔

جواب: قلعہ نظام آباد: نظام آباد میں جانب مغرب ایک بلند پہاڑ پر جس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً تین سو فٹ ہے پر ایک پختہ خوبصورت قلعہ واقع ہے سابقہ محققین اور تاریخ دانوں نے اس کی تعمیر اور تعمیر کنندہ سے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ چونکہ اس قلعہ کی جانب جنوب ایک وسیع تالاب رگھوناتھ تالاب کے نام سے موسوم ہے اس لئے اکثر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس تالاب اور عمارت کا بانی رگھوناتھ داس تھا۔'' جو آصف جاہ سوم نواب صلابت جنگ بہادر 1750ء کی فوج میں رہنما تھے۔ ارسطو جاہ کے حکم پر نظام آباد میں بھی رگھوناتھ داس کے ذریعے قلعے کی تعمیر کروائی گئی۔ اس سے متصل ایک تالاب بنایا گیا۔ دہری فصیل والا یہ قلعہ دراصل ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے سیاسی قیدیوں کو رکھنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ قلعے کے اندر ایک ہال میں بڑی بڑی چکیاں ہیں جو دراصل قیدیوں کو آٹا پیسنے لگانے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ قلعے کا باب الداخلہ بڑی بڑی چٹانوں سے بنایا گیا ہے۔ سنتری کے لئے ایک چوکی بنی ہوئی ہے۔ باب الداخلہ سے گذرنے کے بعد کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ پر ایک اور فصیل اور دروازہ ہے۔ اندر داخل ہونے کے لئے دشوار گذار راستے سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ قلعہ مرہٹوں اور انگریزی افواج کی نقل و حرکت سے باخبر رہنے اور مدافعت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعے میں مندر اور مسجد ہے۔ 1915ء میں مسٹر ہن کرن صدر ناظم محکمہ محابس نے جیل تک پہونچنے کے لئے سیڑھیاں بنوائی۔ قلعہ عرصہ دراز تک قیدیوں کے لئے جیل بنا رہا۔ اب جیل کے لئے علٰحیدہ عمارت تعمیر ہوگئی ہے۔ ایک عرصے تک قلعے کے احاطے میں گورنمنٹ گری راج کالج قائم تھا۔ جواب اپنی ذاتی عمارت محلّہ دوبہ میں قائم ہے۔ قلعے سے جانب مشرق ایک طویل سڑک جو محلّہ پھولانگ کو جاتی ہے درمیان میں سنگ بستہ کمانیں بنائی گئی تھیں۔ سڑک کی کشادگی کے لئے ان پختہ کمانوں کو منہدم کر دیا گیا۔ ایک کمان گڑھی کی کمان کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

Ist INTERNAL EXAMINATIONS MODEL PAPER FOR 2016.

FACULTY OF ARTS /COMMERCE/SCIENCE BA/BCom/BSc Ist YEAR

Ist SEMESTER URDU SECOND LANGUAGE

Time:30 Minutes **Max Marks 20**

NAME:-_____ROLL NO _____ CLASS_____

نوٹ: تمام سوالات کے جوابات اسی پرچے میں حل کریں۔ ہر سوال کا ایک نشان مقرر ہے۔

I° ذیل کے سوالات کے جواب ایک دو حرف میں قوسین میں دیں۔ **1X5=5**

1 غزل کے لغوی معنی کیا ہیں۔ ( )

2 نظم ''پریت کا گیت'' کس نے لکھی۔ ( )

3 ڈرامہ تلاش میں پیٹ کے درد کے علاج کے لئے خان صاحب کیا منگاتے ہیں۔( )

4 گدھا کس جانور کی کھال پہننے پر مار کھاتا ہے۔ ( )

5 حیدر علی شاعر کا تخلص کیا ہے۔ ( )

II° ذیل میں خالی جگہوں کو مناسب جواب سے پر کریں۔ **1X5=5**

1 خدائے سخن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کا لقب ہے۔

2 خواجہ حیدر علی کا تخلص۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔

3 غزل کے آخری شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہتے ہیں۔

4 ۔۔۔۔۔۔کے شمالی ہند سفر سے وہاں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔

5 خراور دہقان حکایت میں گدھا۔۔۔۔۔کی کھال پہن کر لوگوں کو ڈراتا ہے۔

III ذیل میں صحیح جواب کا نشان قوس میں لگائیے۔ **1X5=5**

1 غزل کے اشعار میں استعمال ہونے والے ہم وزن الفاظ کو کہتے ہیں۔

a) مطلع b) تخلص c) قافیہ d) ردیف ( )

2 اندوہ گیں کے معنیٰ ہیں۔

a) خوشحال b) غمزدہ c) فکرمند d) احسان مند ( )

3 اس شاعر نے چھ سال کی مدت میں اپنا دیوان مکمل کر لیا تھا۔

a) ولی b) غالب c) حالی d) آتش ( )

4 اگر کہانی میں تہذیبی قصہ بیان ہوتو اسے کہتے ہیں۔

a) داستان b) مثنوی c) حکایت d) محاورہ ( )

5 حکیم لقمٰن کس بات کے لئے مشہور تھے۔

a) حکمت b) خدمت c) سخاوت d) کنجوسی ( )

IV ذیل کے سوالات کا درست جوڑ ملایئے۔ **1X5=5**

1	غزل میں ہم وزن الفاظ کو کیا کہتے ہیں۔	( )	(a) پانی پت
2	ڈرامہ تلاش میں خان صاحب اور چچا کے درمیان کون لڑائی لگاتا ہے۔	( )	(b) میر تقی میر
3	الطاف حسین حالی کہاں پیدا ہوئے۔	( )	(c) قافیہ
4	کونسا جانور مردہ انسان کو نہیں کھاتا۔	( )	(d) نوکر
5	کس شاعر کے کلام میں غم کے عناصر پائے جاتے ہیں۔	( )	(e) ریچھ
			(f) غالب
			(g) لکھنو

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اردو معروضی سوال جواب برائے ڈگری سال اول زبان دوم اردو مضمون معہ ماڈل پیپر

انٹرنل امتحانات بی اے، بی کام، بی ایس سی، سال اول سمسٹر اول

۱) ۔۔۔۔۔۔۔ اردو شاعری کی مقبول صنف ہے۔(غزل)

۲) غزل کے لغوی معنیٰ ۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(عورتوں سے باتیں کرنا)

۳) ۔۔۔۔۔۔۔ کو کوزے میں سمندر بند کرنے کا فن کہتے ہیں۔(غزل)

۴) غزل کے پہلے شعر کو ۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(مطلع)

۵) غزل کے اشعار میں استعمال ہونے والے ہم وزن الفاظ کو ۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(قافیے)

۶) قافیوں سے غزل میں ۔۔۔۔۔۔۔ پیدا ہوتا ہے۔(ترنم)

۷) غزل کے اشعار میں شعر کے ختم پر استعمال ہونے والے مسلسل الفاظ کو ۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(ردیف)

۸) ذیل کے شعر میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجئے۔

۹) کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

۱۰) (زندگانی۔ٹھانی۔قافیے۔اور ہے۔ردیف)

۱۱) غزل کے اشعار کی تعداد۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوتی ہے۔(کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ اکیس)

۱۲) غزل کے اچھے شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(شاہ بیت۔حاصل غزل شعر)

۱۳) غزل کے آخری شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(مقطع)

۱۴) غزل کے آخری شعر میں شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ استعمال کرتا ہے۔(تخلص)

۱۵) لفظ مطلع۔۔۔۔۔۔۔۔ سے بنا ہے۔(لفظ طلوع سے)

۱۶) غزل میں شاعر اپنی بات کو دو یا اس سے ذائد اشعار میں کہے تو اسے۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(قطعہ)

۱۷) تخلص کی نشانی۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔( )

۱۸) غزل میں وزن۔۔۔۔۔کے رعایت سے پیدا ہوتا ہے۔(بحر)

۱۹) غزل میں۔۔۔۔۔کے ذریعے دو یا ذائد اشعار میں بات مکمل کی جاتی ہے۔(قطعہ)

۲۰) خواجہ حیدر علی کا تخلص۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(آتش)

۲۱) میر تقی کا تخلص۔۔۔۔۔۔۔۔ہے(میرؔ)

۲۲) محمد سراج الدین کا تخلص۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(سراجؔ)

۲۳) ولی کی غزل میں ''پی'' کا مطلب۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(محبوب)

۲۴) ولی کی غزل میں لفظ ''مئے'' کے معنیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں(شراب)

۲۵) سراجؔ کی غزل میں ''ابدی'' کا مفہوم۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(ہمیشہ ہمیشہ)

۲۶) سراجؔ کی غزل میں ''اندوہ گیں'' کا مطلب۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(غم زدہ)

۲۷) اردو غزل کے مشہور شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ کا تعلق گجرات سے تھا۔(ولیؔ)

۲۸) ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے شمالی ہند سفر سے وہاں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔(ولیؔ)

۲۹) ولیؔ کا انتقال۔۔۔۔۔۔۔۔ سنہ میں ہوا۔(1707ء)

۳۰) اردو غزل کے مشہور شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ نے چھ سال کی عمر میں اپنا دیوان مکمل کیا۔(سراجؔ)

۳۱) ولیؔ کے بعد اردو کے مشہور غزل گو شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں(سراجؔ)

۳۲) میر تقی میرؔ کا سنہ پیدائیش۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(1722ء)

۳۳) میر تقی میرؔ کا سنہ وفات۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مقام وفات۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(1810ء۔لکھنو)

۳۴) میرؔ کی شاعری کے کُل۔۔۔۔۔۔۔۔دیوان ہیں۔(چھ)

۳۵) اردو کے مشہور شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔(میر تقی میرؔ)

۳۶) درد وغم کے جذبات شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ کے ہاں زیادہ ملتے ہیں۔(میر تقی میرؔ)

۳۷) دل اور دلی کی تباہی کا ذکر شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اپنی شاعری میں زیادہ کیا ہے۔(میر تقی میرؔ)

۳۸) نظم توحید۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی۔(نظیر اکبر آبادی)

۳۹) سید ولی محمد کا تخلص۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(نظیرؔ)

۴۰) نظیرؔ کا جائے پیدائیش۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(دہلی)

۴۱) نظیرؔ نے شہر۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنی ساری زندگی گذاری۔(اکبر آباد آگرہ)

۴۲) اردو کا عوامی اور جمہوری شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ کو کہتے ہیں۔(نظیرؔ)

۴۳) اردو کے شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اپنے کلام میں مقامی الفاظ اور محاورے استعمال کئے۔(نظیرؔ)

۴۴) اردو کے شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ کے کلام میں ہندوستانی تہذیب جھلکتی ہے۔(نظیرؔ)

۴۵) آدمی نامہ اور بنجارہ نامہ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی ہیں۔(نظیرؔ)

۴۶) نظم توحید کے ہر بند میں۔۔۔۔۔۔۔۔ مصرعے ہیں۔(دس)

۴۷) نظم کے ہر بند میں اگر دس مصرعے ہوں تو اسے۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(مسدس)

۴۸) نظیرؔ کے مطابق اللہ کی قدرت کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کے مطالعے سے پہچانا جا سکتا ہے۔(قدرت۔فطرت)

۴۹) نظم مستقبل۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی (اکبرؔ الہ آبادی)

۵۰) سید اکبر حسین کا تخلص۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(اکبرؔ الہ آبادی)

۵۱) اکبر الہ آبادی کے والد کا نام۔۔۔۔۔۔۔۔ (سید تفضّل حسین)

۵۲) اردو کے شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ نے وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور بہ طور جج خدمات انجام دیں۔(اکبرؔ الہ آبادی)

۵۳) اپنی مزاحیہ شاعری کے ذریعے مغربی تہذیب کا مذاق۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اڑایا۔(اکبر الہ آبادی)

۵۴) اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے لئے۔۔۔۔۔۔۔۔ شہرت رکھتے ہیں۔(اکبرؔ الہ آبادی)

۵۵) ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اپنی شاعری میں سر سید احمد خان کی مخالفت کی تھی۔(اکبرؔ الہ آبادی)

۵۶) اردو کے شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اپنی مزاحیہ شاعری میں انگریزی الفاظ استعمال کئے۔

۵۷) نظم فنون لطیفہ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی۔(اقبالؔ)

۵۸) شاعر مشرق۔۔۔۔۔۔۔۔ کا لقب ہے۔(اقبالؔ)

۵۹) اقبال کا سنہ پیدائیش۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مقام پیدائیش۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(1873۔سیالکوٹ)

۶۰) اقبال کے والد کا نام۔۔۔۔۔۔۔۔ تھا۔(نور محمد)

۶۱) اقبال کے دو مشہور اساتذہ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(سید میر حسن۔پروفیسر آرنلڈ)

۶۲) اقبال نے جرمنی کی ۔۔۔۔۔۔۔۔ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔(میونخ یونیورسٹی)

۶۳) اردو کے فلسفی شاعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ کہلاتے ہیں۔(اقبالؔ)

۶۳) ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اپنی شاعری کے ذریعے پیغمبری کی۔(اقبالؔ)

۶۴) اقبال کے شعری مجموعوں کے نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(بانگ درا۔بال جبریل۔ضرب کلیم۔ارمغان حجاز)

۶۵) اقبالؔ کا انتقال ۔۔۔۔۔۔۔۔ کو ہوا(21 اپریل 1938ء۔لاہور)

۶۶) نظم پریت کا گیت ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی۔(حفیظ جالندھری)

۶۷) حفیظ جالندھری کا سنہ پیدائش ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مقام پیدائش ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(1900ء۔جالندھر)

۶۸) حفیظ جالندھری کی مشہور نظم ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(شاہنامہ اسلام)

۶۹) اپنے گیتوں کے لئے شاعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ مشہور ہیں۔(حفیظ جالندھری)

۷۰) حفیظ جالندھری کے شعری مجموعہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(نغمہ زار۔سوز وساز)

۷۱) رسالہ تمہید کے ایڈیٹر کا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(عبدالقدیر مقدر) ہے۔

۷۲) ضلع نظام آباد کا قدیم نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(اندور)

۷۳) قلعہ کے تالاب کا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(رگھوناتھ تالاب)

۷۴) نظام آباد کے گنج کا قدیم نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھا۔(محبوب گنج)

۷۵) باپو جی واچنالیہ کتب خانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نے ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں قائم کیا۔(احمداللہ خاں ۔۔1908 میں)

۷۶) نظام آباد کا سرکاری دواخانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں قائم ہوا۔(1970)

۷۷) سرکاری دواخانہ نظام آباد کے پہلے سول سرجن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھے۔(ڈاکٹر قمرالدین)

۷۸) ڈچپلی کا جذامیوں کا دواخانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنظیم نے قائم کیا۔(ویلسن مشن تنظیم نے)

۷۹) مسجد عروب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں قائم ہوئی۔(1836)

۸۰)) مظہر علی خان ولاؔ کا ایک اور نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ تھا۔(مرزا علی لطف)

۸۱) مظہر علی خان نے ۔۔۔۔۔۔۔۔ کالج میں ملازمت کی۔(فورٹ ولیم کالج)

۸۲) ہفت گلشن ۔۔۔۔۔۔۔۔ کی ترجمہ شدہ کتاب ہے۔(مظہر علی خان ولاؔ)

۸۳) اردو حکایات ۔۔۔۔۔۔۔۔ کتاب سے لی گئیں۔(ہفت گلشن)

۸۴) اردو کا مشہور ڈرامہ انارکلی ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھا۔(امتیاز علی تاج)

۸۵) چچا چھکن کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی۔(امتیاز علی تاج)

۸۶) ڈرامہ تلاش ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے ترتیب دیا۔(قدسیہ زیدی)

۸۷) قدسیہ زیدی کی ۔۔۔۔۔۔۔۔ کتاب مشہور ہوئی۔(گاندھی بابا کی کہانی)